وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ وفاق المدارس ملتان

جلد نمبر: ۲۵ شمارہ نمبر: ۱ محرم الحرام ۱۴۴۸ھ جولائی ۲۰۲۶ء

بیاد

شمس العلماء
حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ العلماء
حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ

محدث العصر
حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

مفکر اسلام
حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ

جامع المعقول والمنقول
حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

رئیس المحدثین
حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

استاذ المحدثین
حضرت مولانا عبد الرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ

سرپرست

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

شیخ الحدیث حضرت مولانا انوار الحق حقانی مدظلہم
سینئر نائب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر اعلیٰ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم
ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر

مولانا محمد احمد حافظ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

وفاق المدارس العربیہ پاکستان گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

فون نمبر 061-6514525-6514526-27 فیکس نمبر 061-6539485
Email:wifaqulmadaris@gmisl.com web:www.wifaqulmadaris.org

ناشر: حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری ● مطبع: اقرا اختر پرنٹنگ پریس پرانی غلہ منڈی پاور گیٹ ملتان
شائع کردہ مرکزی دفتر وفاق المدارس العربیہ گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

نئے ہجری سال ۱۴۴۸ھ کا آغاز اور تاریخ کے اسباق	کلمۃ المدیر	۳
وُجودِ باری تعالیٰ نقل وعقل کی روشنی میں	حضرت مولانا محب اللہ (لورالائی)	۶
تحریک تجدّد کا پس منظر اور اس کی فکری بنیادیں	شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم	۱۱
اَحادیث قدسیہ!......ایک تعارف	مولوی محمد عمر رفیق	۲۲
اساتذہ اور علماء کے ساتھ وفاداری	اسماعیل محمد عباس	۲۸
تہذیبوں کے زوال کے اسباب	مولانا رشید احمد فہیم	۳۱
عربی نثر وبلاغت کے ائمہ	استاذ محمد علی	۳۵
سافٹ ویئر کی ماہیت وحقیقت	جناب مبشر رحمانی	۴۱
حضرت مولانا محمد ادریس حقانی رحمۃ اللہ علیہ کی المناک شہادت	تحریر مولانا عرفان الحق حقانی	۴۹
مولانا ڈاکٹر عبدالشہید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ	مولانا اکمل جمال	۵۹

﴿مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں﴾

سالانہ بدل اشتراک

بیرون ملک امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک ۳۰ ڈالر-سعودی عرب، انڈیا اور متحدہ امارات وغیرہ ۲۳ ڈالر-ایران، بنگلہ دیش ۲۰ ڈالر-

اندرون ملک قیمت: فی شمارہ: 40 روپے، زر سالانہ مع ڈاک خرچ: 540 روپے

کلمۃ المدیر

نئے ہجری سال ۱۴۴۸ھ کا آغاز

اور تاریخ کے اسباق

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

دنوں کا ہیر پھیر، مہینوں اور سالوں کا اختتام و آغاز انسان کو کئی اہم حقیقتوں کی یاد دلاتا ہے، ہر گزرتا دن ہماری عمر کا ایک حصہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ جو کل مستقبل تھا، وہ آج ماضی بن چکا ہے۔ سالوں کا بدلنا اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ دنیا میں کوئی چیز مستقل نہیں۔ حالات، موسم، طاقت، دولت اور خود انسان بھی تبدیلی کے عمل سے گزرتے ہیں۔

تاریخ قوموں کا دفترِ حیات اور حکمتوں کا خزانہ ہے۔ جو شخص اس کے اَسرار و رُموز میں غوطہ زَن ہوتا ہے، گویا اپنی عمر میں کئی عمریں بڑھا لیتا ہے، اور جو تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کرتا ہے، وہ گزشتہ نسلوں کے وسیع ورثے سے فائدہ اٹھاتا ہے، ان کے تجربات سے سبق سیکھتا ہے اور گزرے ہوئے لوگوں کے انجام سے عبرت حاصل کرتا ہے۔

کیا قرآنِ کریم نے تاریخ کے واقعات میں غور و فکر کرنے اور سابقہ اقوام کے انجام سے سبق حاصل کرنے کی رہنمائی نہیں کی؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَوَ لَمۡ یَہۡدِ لَہُمۡ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ یَمۡشُوۡنَ فِیۡ مَسٰکِنِہِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ ؕ اَفَلَا یَسۡمَعُوۡنَ؟!۔

اور کیا ان (کافروں) کو اس بات سے کوئی ہدایت نہیں ملی کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کے گھروں میں یہ خود چلتے پھرتے ہیں؟ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ تو کیا یہ لوگ سنتے نہیں ہیں؟ (السجدہ:26)

اور دوسری جگہ فرمایا:

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡۤا اَکۡثَرَ مِنۡہُمۡ وَ اَشَدَّ قُوَّۃً وَّ اٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ

بھلا کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے جو لوگ تھے، ان کا انجام کیسا ہوا وہ ان سے تعداد میں زیادہ تھے، اور طاقت میں بھی ان سے بڑھے ہوئے تھے، اور ان یادگاروں میں بھی جو وہ زمین میں چھوڑ کر گئے ہیں۔ پھر بھی جو کچھ وہ کماتے تھے، وہ ان کے کچھ کام نہیں آیا۔ (غافر:82)

انسانوں کے لیے تاریخ کا مطالعہ اور انسانیت کے آغاز سے لے کر آج تک کے تجربات سے آگاہی ناگزیر ہے، کیونکہ انسانیت ایک باہم مربوط اور مسلسل زنجیر ہے جس کے ماضی، حال اور مستقبل کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ انسان ایک ہی فطرت رکھتا ہے، ایک ہی زمین پر آباد ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے لیے ایسے قوانین اور ضابطے مقرر کیے ہیں جو زندگی کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کی طرف سے آسمانی وحی بھی انسان کو اس کے مقاصد سے آگاہ کرتی اور اسے وہ حدود دکھاتی ہے جن سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

تاریخ کی اہمیت کے بارے میں امام احمد بن عبدالوہاب النویریؒ (متوفی 733ھ) فرماتے ہیں:

''تاریخ ایسی چیز ہے جس کی ضرورت بادشاہ اور وزیر، سپہ سالار اور امیر، کاتب اور مشیر، مالدار اور غریب، دیہاتی اور شہری، مقیم اور مسافر سب کو ہوتی ہے۔ بادشاہ اس سے گزری ہوئی سلطنتوں اور سابقہ اقوام کے حالات سے عبرت حاصل کرتا ہے، وزیر اپنے پیش رو اہلِ تدبیر و سیاست کے اعمال سے رہنمائی لیتا ہے، سپہ سالار جنگی تدابیر اور معرکوں کے حالات جانتا ہے، مشیر غور و فکر اور بصیرت حاصل کرتا ہے، کاتب اپنی تحریروں میں اس سے استشہاد کرتا ہے، مالدار دنیا کی ناپائیداری کو سمجھ کر اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا کرتا اور اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے، جبکہ غریب زہد و قناعت کی طرف راغب ہوتا ہے، کیونکہ وہ جان لیتا ہے کہ دنیا ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں۔ اور دیگر لوگ اسے تفریح، علمی گفتگو اور اقوام و ملل کے حالات جاننے کے لیے پڑھتے ہیں۔''

ہم ایک ایسے علم کے سامنے ہیں جو فہم و ادراک کی کنجی اور علوم کا رہنما ہے۔ اس کی معرفت ذہن کے دریچے کھولتی، بصیرت کو روشن کرتی اور انسان کو مختلف حالات میں متوازن رویہ اختیار کرنے اور مناسب فیصلے کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ تاریخ مستقبل کے فیصلوں کے لیے قیمتی اسباق فراہم کرتی ہے، مذہبی، معاشرتی، ثقافتی تنوع کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

لوگ عموماً کہتے ہیں کہ ''تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے''۔ یہ بات اپنے مفہوم کے اعتبار سے درست ہے، کیونکہ انسانی دنیا کے واقعات ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ انسان اپنی سوچ، ملکیت کی خواہش، انفرادیت پسندی، زمین پر قبضے کی حرص اور دوسروں پر برتری جتانے کے رجحان میں بنیادی طور پر ایک ہی جیسا ہے۔

انسانی تاریخ میں ہمیشہ دو گروہوں کے درمیان کشمکش رہی ہے: ایک وہ جو خیر اور بھلائی کے ساتھ وابستہ رہا، زمین اور اہلِ زمین کی تعمیر و اصلاح کا خواہش مند رہا، لوگوں میں محبت، ہم آہنگی اور دینی و اَخلاقی اقدار کو فروغ دیتا رہا؛ دوسرا وہ جو سازشوں، فتنہ انگیزی، اخلاقی بگاڑ، فساد کی سرپرستی اور اختلاف و دشمنی کے بیج بونے میں مصروف رہا۔

انسانی فطرت کا یہی پہلو ہمیں تاریخ پڑھنے پر مجبور کرتا ہے تاکہ ہم جان سکیں کہ خیر نے شر کا مقابلہ کیسے کیا؟، اور

فضیلت کی اَقدار نے کس طرح سازشوں اور رکاوٹوں کے باوجود اپنی جگہ ثابت قدمی دکھائی ؟!۔

مزید یہ کہ تاریخ کا مطالعہ نہ صرف مفید ہے بلکہ نہایت دلچسپ بھی ہے۔اس کے ذریعے آپ مختلف سلطنتوں کے حالات، اقوام کی عادات و اطوار، لوگوں کے طرزِ زندگی، جنگوں اور تنازعات کے اَسباب، مذاکرات کی مجالس، سازشوں کے نتائج، خائنوں اور مفسدوں کے انجام، اور ظالم وجابر حکمرانوں کے زوال سے واقف ہوتے ہیں۔

تاریخ کی ایک اور بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ فرد اور معاشرے کی قومی اور ثقافتی شناخت کی تعمیر کرتی ہے۔اس کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ اقدار اور روایات وقت کے ساتھ کیسے ارتقا پذیر ہوئیں۔

اسی طرح تاریخ ہمیں اپنے ورثے کی حفاظت، اس کی ترقی اور اپنی تہذیبی جڑوں پر فخر کرنے کا شعور عطا کرتی ہے۔اور ان تمام فوائد سے بڑھ کر تاریخ کا مطالعہ انسان کو ایک ایسی حقیقت تک پہنچاتا ہے جو تمام یقینوں کی بنیاد ہے؛ وہ یہ کہ انجامِ کار متقیوں ہی کے حق میں ہوتا ہے، اور حق ہمیشہ باقی رہتا ہے، اگرچہ وقتی طور پر اس کی حکومت اور غلبہ کمزور پڑ جائے۔اس یقین سے دل مطمئن ہو جاتا ہے اور انسان اس اٹل حقیقت کو سمجھ لیتا ہے کہ:

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

اللہ اپنے کام پر غالب ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

بہر حال! نئے سال یا نئے مرحلے کا آغاز انسان کو یہ سوچنے کا موقع دیتا ہے کہ اس نے گزشتہ وقت کیسے گزارا؟ کیا حاصل کیا؟ اور کن کوتاہیوں کی اصلاح کی ضرورت ہے؟۔تاریخ کا سبق یہ ہے کہ گزرے ہوئے دن واپس نہیں آتے۔اس لیے ہر لمحہ قیمتی ہے اور اسے نیک اعمال، تحصیلِ علم، خدمتِ خلق اور مفید کاموں میں صرف کرنا چاہیے۔ رات اور دن، مہینوں اور سالوں کا مسلسل گردش کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کی روشن نشانی ہے۔قرآن کریم بار بار انسان کو ان تبدیلیوں میں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

وقت کا ہر نیا مرحلہ انسان کو نئی شروعات، بہتر منصوبہ بندی اور اپنی زندگی کو زیادہ بامقصد بنانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔مختصراً، دنوں اور سالوں کا بدلنا ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ وقت ایک امانت ہے، زندگی محدود ہے، اور کامیاب انسان وہی ہے جو گزرتے لمحوں کو اپنی آخرت اور دنیا کی بہتری کے لیے استعمال کرے۔

وُجودِ باری تعالیٰ نقل وعقل کی روشنی میں

حضرت مولانا محب اللہ (لورالائی)

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب تورات، حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب زبور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب انجیل اور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید سب کے سب اللہ تعالیٰ کے وجود پر متفق ہیں۔

تورات کو ماننے والے یہود، انجیل کو ماننے والے عیسائی / انگریز، زبور کو ماننے والی قوم (بنی اسرائیل)، قرآن مجید کو ماننے والے مسلمان، سب کا یہی متفقہ فیصلہ اور اتفاق ہے کہ اللہ تعالی موجود ذات ہے، کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

اللہ تعالی کے وجودِ مقدس پر چاروں مذاہب کے اماموں کے عقلی دلائل:

دلیل نمبر 1 اللہ تعالی کے وجود مقدس پر حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عقلی دلیل:

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی دہریہ کا جو اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر تھا مناظرہ، بحث ومباحثہ رکھا گیا۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں مناظرہ کے لیے تو تیار ہوں لیکن فی الحال میں ایک پریشانی میں ہوں۔ دہریہ نے پوچھا کیا پریشانی ہے؟۔

امام صاحب نے فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ ایک کشتی نے وزنی سامان لے کر منزل مقصود پر پہنچادیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کشتی پر سامان رکھنے کے لیے کوئی نہ تھا۔ کشتی چلانے والا ملاح بھی نہ تھا۔ کشتی خود بخود سامان لے کر منزل پر آگئی اور سامان پہنچادیا۔ اس بات سے مجھے حیرانی ہوئی ہے۔ دہریہ یہ سن کر بولا کہ یہ بات کوئی عقلمند آدمی مان نہیں سکتا ہے۔ اور ایسی نہایت غیر معقول بات کوئی عقلمند قبول نہیں کرسکتا۔ یہ کوئی یقین کرنے والی بات ہے؟

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ چھوٹی سی کشتی، تھوڑا سا سامان، مختصر منزل پر بغیر کسی ڈرائیور کے نہیں پہنچ سکتا تو ساری کائنات، حکمتوں اور نعمتوں سے بھری آسمانی مخلوقات، زمینی مخلوقات، انسان کا موجود ہونا ہر چیز پر قادر ذات، ہر چیز سے باخبر ذات، سننے دیکھنے والی ذات، زبردست حکمت اور تدبیر والی ذات کے بغیر کس

طرح وجود میں آسکتے ہیں؟۔ان کے وجود کے لیے ایسے موجود خالق کی ضرورت ہے جو ہر چیز پر قادر ہو کیونکہ عاجز کچھ نہیں کرسکتا، جو ساری مخلوقات سے باخبر ہو کیونکہ بے خبر کیا کرسکتا ہے؟۔جو زبردست حکمت اور تدبیر والا ہو کیونکہ بے حکمت اور بے تدبیر والا کیا کرسکتا ہے۔اسی ذات کا نام خالق، مالک، رازق اور اللہ ہے۔

دہریہ لاجواب ہوگیا، توبہ کی اور حق کی طرف رجوع کیا، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر ایمان لایا اور اللہ تعالیٰ کی خدائی اور معبود برحق ہونے کا اقرار کیا۔

مناظرہ میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیت گئے اور کامیاب ہوگئے۔الحمدللہ۔

دلیل نمبر 2۔اللہ تعالیٰ کے وجود مقدس پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی عقلی دلیل:

ساری دنیا کے انسان ایک جیسے ہیں۔سب آنکھ، کان منہ، ناک والے ہیں۔دو ہاتھ پاؤں والے ہیں۔ ان کے اعضاء میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن ساری دنیا کے انسان مرد وخواتین بڑے چھوٹے ایک دوسرے سے پہچان میں الگ الگ ہوتے ہیں۔شکل رنگ، زبان اور آوازوں سے پہچان ہوتی ہے۔ ایک دوسرے سے نہ شکل ملتی ہے نہ زبان اور نہ ہی آواز ملتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے سب کو ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔کروڑوں اربوں میں سے باپ، بیٹے، بیٹیاں، بیوی، خاوند وغیرہ پہچانے جاتے ہیں۔یہ اللہ تعالیٰ کے وجود کی زبردست دلیل ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ مہربان نہ ہوتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔خصوصاً انگوٹھے کا نشان کروڑوں، اربوں میں بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔یہ اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے پر، ہر چیز پر قادر ہونے پر زبردست دلیل ہے۔کمپیوٹر سائنس والوں سے اس کی تصدیق کرلیں۔

دلیل نمبر 3: اللہ تعالیٰ کے وجود مقدس پر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی عقلی دلیل:

انڈہ اوپر سے چاندی جیسا ہے سفید خول ہے اور اس کے اندر سونے جیسا زرد رنگ والا انڈے کا مغز ہے۔اوپر سے اندر تک کوئی دروازہ کھڑکی یا سوراخ نہیں ہے۔عجیب بات یہ ہے کہ کچھ دنوں کے بعد اندر سے حکمت سے بھرا ہوا اور دیکھنے کے لئے آنکھوں والا اور سننے کے لئے کانوں والا اور خون کے چلانے کے لیے رگوں کے انتظام والا مرغی کا بچہ حساس، سمجھدار آواز والا پرندہ نکلتا ہے۔یہ مرغی کا بچہ ہر چیز سے باخبر دیکھنے، سننے والی، حکمت اور تدبیر والی ذات نے بنایا ہے۔اگر ایسی کامل صفات والی ذات نے نہیں بنایا تو کون ہے کہ ایسا باکمال مرغی کا بچہ انڈے کے اندر سے پیدا کرسکتا ہے؟۔

کامل صفات والی ذات نے ہی اس کو پیدا کیا ہے۔غیر اللہ کی کیا قدرت ہے کہ ایسا کرسکے۔صحیح عقل والا یہی

فیصلہ کرتا ہے۔اس چھوٹی سی مثال سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، ہر چیز پر قادر ہے، ساری مخلوق سے باخبر ہے، ہر وقت حاضر و ناظرہ۔حکمت اور تدبیر والی ذات ہے کیونکہ ہر چیز سے باخبر، حاضر و ناظر، حکمت و تدبیر والی ذات ہی یہ کرسکتی ہے۔اس کے علاوہ یہ کون کرسکتا ہے۔ساری دنیا کے لوگ مل کر ایسا مرغی کا بچہ پیدا نہیں کر سکتے تو ساری کائنات، آسمانی مخلوق، زمینی مخلوق کس طرح پیدا کر سکتے ہیں؟ ہاں! کامل صفات والی ذات، ہر عیب سے پاک ذات نے ساری مخلوقات کو پیدا بھی کیا ہے اور ہر چیز پر قادر، باخبر، حاضر و ناظر بھی ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح عقل نصیب فرمائے۔آمین!۔

دلیل نمبر 4:اللہ تعالی کے وجود مقدس پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی عقلی دلیل:

توت کے پتوں کو ریشم کے کیڑے بھی کھاتے ہیں،شہد کی مکھیاں بھی چوستی ہیں، ہرن بھی کھاتے ہیں اور بکریاں گائے وغیرہ بھی کھاتی ہیں۔کیڑے سے ریشم نکلتی ہے،مکھی سے شہد نکلتا ہے، ہرن سے مشک کی خوشبو نکلتی ہے اور بکریاں گائے وغیرہ سے مینگنیاں اور گوبر نکلتا ہے۔کھانا سب کا ایک ہی ہے یعنی پتے لیکن آخری انجام مختلف ہے۔ کوئی ایسی کامل قدرت والی ذات،حکمت اور تدبیر والی ذات، باخبر حاضر و ناظر مقدس ذات موجود ہے کہ ایسے مختلف نتائج سرانجام دیئے ہیں اللہ تعالی ہماری ہر قسم کی حفاظت فرمائے،آمین!۔

دلیل نمبر 5:اللہ تعالی کے وجود مقدس پر مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی عقلی دلیل:

یہ بین الاقوامی فیصلہ ہے کہ کسی کام کے کرنے کے بارے میں اکثر لوگوں کا اتفاق معتبر ہے یعنی 95 فیصد لوگوں کا اتفاق ہوا کام کرنے کا اور 5 فیصد نے فیصلہ کیا کام نہ کرنے کا تو نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

95 فیصد لوگوں کو ترجیح ہوتی ہے اور اس کو آگے چلانا چاہیے جبکہ 5 فیصد والوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔اسی طرح اللہ تعالی کے وجود پر سارے مسلمانوں کا، سارے اہل کتاب نصاری (انگریز)، یہود (اسرائیل) سارے ہندو اور مشرکین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے۔مسلمان تو اللہ تعالیٰ پر پکے صحیح عقیدے والے ہیں۔یہود و نصاریٰ اہل کتاب ہیں اور اللہ تعالیٰ کو سو فی صد مانتے ہیں۔اگر کافر ہیں تو ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار اور قرآن پاک کے انکار سے کافر ہیں۔ہندو اور مشرکین بھی اللہ تعالیٰ کو سو فی صد مانتے ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر کو شریک ٹھہراتے ہیں اور شرک کی وجہ سے کافر بن گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کے انکار سے کافر بن گئے۔

خلاصہ یہ کہ دُنیا میں تقریباً 95 فی صد لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں۔ہاں تھوڑے سے لوگ دہریہ، جو تقریبا 5 فی صد ہیں، اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل نہیں ہیں۔5 فی صد کا کیا اعتبار ہے؟ وہ اعتبار سے ساقط ہیں۔

دلیل نمبر 6: اللہ تعالیٰ کے وجود مقدس پر بندہ ناچیز محب اللہ عفی عنہ کی عقلی دلیل:

یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ جو چیز معدوم (جس کا کوئی وجود نہ ہو) اور غیر موجود تھی اور بعد میں وجود میں آ گئی تو اس کا وجود کسی موجود ذات کے کرنے سے وجود میں آ سکتا ہے۔ خود بخود معدوم اپنے وجود کا کس طرح سبب بن سکتا ہے۔ معدوم تو خود معدوم ہے، اس کا وجود نہیں ہے تو یہ معدوم کس طرح اپنے آپ کو وجود دے سکتا ہے؟۔ جیسے کسی کے پاس روٹی نہیں اور بھوک سے مر رہا ہے تو دوسروں کو کسی طرح روٹی دے سکتا ہے؟۔ جیسا کہ کوئی جاہل ہو، اس کے پاس کوئی معلومات نہیں تو وہ دوسرں کو کیا معلومات دے سکتا ہے؟۔ یہ بین الاقوامی فیصلہ ہے اور ہر عاقل اس پر یقین رکھتا ہے۔ ہاں! موجود پہلے سے معدوم تھا، کسی موجود ذات کے وجود دینے سے موجود ہو سکتا ہے۔ مثلاً کوئی مینار، گاڑی، گھڑی الماری، دروازہ مشین، چپل ٹشو پیپر وغیرہ پہلے سے معدوم تھے پھر وجود میں آ گئے تو کسی موجود کے کرنے سے یہ چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ مکان، مینار، مستری کے کرنے سے موجود ہوتے ہیں۔ گاڑی، الماری، دروازہ، چپل وغیرہ کاریگر کے کرنے سے موجود ہوتے ہیں ورنہ عدم (موجود نہ ہونا) سے موجود نہیں ہو سکتے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ چیزیں خود بخود وجود میں آ گئیں، کسی کاریگر کے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تو یہ بین الاقوامی پاگل ہوگا۔ اسے پاگل خانے میں زبردستی سے داخل کروانا چاہیے۔ انسان اصل میں معدوم تھے۔ آج دنیا میں جتنے لوگ موجود ہیں دوسو سال پہلے نہیں تھے یعنی معدوم تھے اور آج موجود ہیں۔ ساری مخلوقات آسمانی ہو یا زمینی پہلے معدوم تھی اور آج موجود ہیں۔ اس کی دلیل کیا ہے؟

دلیل یہ ہے کہ ساری مخلوقات، انسان کے علاوہ انسان کی خدمت اور ضروریات زندگی کے لئے وجود میں آئیں اور پیدا ہوئیں۔ زمین انسان کے لئے فرش اور آسمان چھت ہے۔ سورج روشنی کے لئے، چاند تاریخ کے لئے، ستارے چھت کی زینت کے لئے، ہوا آکسیجن کے لئے، پانی پینے، صفائی فصلوں، حیوانات اور تعمیرات وغیرہ کی ضروریات کے لئے ہیں۔ فصلیں ساری کی ساری انسان کے کھانے کی ضرورت کے لئے ہیں۔ حیوانات سارے کے سارے انسانی ضروریات کے لئے وجود میں آ گئے۔ جب انسان پہلے سے معدوم تھے، اسی طرح جو مخلوقات وجود میں آئیں وہ بھی پہلے معدوم تھیں بعد میں انسان کی خدمت کے لئے وجود میں آ گئیں۔ تو انسان عدم کے بعد وجود میں اور ساری مخلوقات عدم کے بعد انسانیت کی خدمت کے لئے وجود میں آنے کے لئے کسی حقیقی، اصلی، ذاتی، ازلی موجود ذات کے محتاج ہیں جو اصل سے موجود تھا، ازلی تھا (اس کے وجود کی ابتدا نہیں) ابدی ہوگا (اس کا آخر نہیں ہوگا)۔ اسی ذات کا نام اللہ ہے۔ انسان کو عدم سے اسی ذات نے وجود دیا اور ساری مخلوقات کو انسان کی ضروریات کے لئے اس ذات نے پیدا کیا۔ تو عقل کا فیصلہ یہی ہے

کہ حقیقی، اصلی، ذاتی، ازلی وجود اسی ذات کا ہے جو ساری کائنات کے وجود کا سبب ہے۔ ساری کائنات اسی ذات کے وجود دینے سے وجود میں آ گئی ورنہ کس طرح وجود مل سکتا ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالی اصل سے موجود ذات تھی اور ہے اور رہے گی۔ عقل کا بھی یہی فیصلہ ہے اور نقل کا بھی۔ اسی طرح ساری کائنات انسان ہو یا انسان کی ضروریات کے لئے آسمانی مخلوقات ہو یا زمینی، پہلے سے معدوم تھے پھر وجود میں آ گئے۔ اسی ذات واجب الوجود کے وجود دینے سے وجود میں آ گئے۔ اگر اسی ذات نے اس کو وجود نہیں دیا تھا تو یہ معدوم کائنات کس طرح وجود میں آ سکتی تھی۔ اس سے پتہ چلا کہ حقیقی اصلی، ذاتی، ازلی وجود اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے، عاجز کیا کر سکتا ہے، ہر چیز سے باخبر ہو، بے خبر کیا کر سکتا ہے۔ ساری مخلوقات کے پاس حاضر ہونا، ناظر ہونا ضروری ہے۔ جب حاضر بھی ہو، ناظر بھی ہو تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ ساری کائنات کا وجود، مضبوط آسمان، حکمت سے بھرا ہوا سورج، چاند، ستارے اور پہاڑ نعمتوں سے بھری ہوئی زمین فصلیں حیوانات اور حکمت اور نعمتوں سے بھرے ہوئے انسان کا عجیب تدبیر سے وجود میں آنا اس ذات واجب الوجود اللہ تعالی کے وجود مقدس کی زبردست دلیل ہے۔ یہی ذات ہر چیز پر قادر ہونے اور ہر چیز سے باخبر ہونے اور ہر چیز کے پاس حاضر اور ناظر ہونے کی کھلم کھلا دلیل ہے۔ اللہ تعالی ہم سب کو صحیح عقل نصیب فرمائے، آمین۔

ہمارے لئے کیا ہونا چاہیے؟

جب یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالی حق رب موجود ذات ہے، ازلی ابدی ہے، اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں، مخلوق اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں۔ اسی ذات نے انسان کو اور انسان کی خدمت اور ضروریات زندگی کے لئے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اور اسی ذات نے ہمیں پیدا کیا اور واپس اسی ذات کی طرف جانا ہے۔ اسی ذات نے ہماری ضروریات آسمان سے، زمین سے اور ہمارے اندرون سے جتنی ضروریات ہیں ساری کی ساری بغیر قیمت مفت دی ہیں۔ تو ہمارے لئے یہ فیصلہ ہے کہ اسی ذات کو راضی کر لیں اور اس کی عبادت میں لگے رہیں اور اس کے ساتھ تعلق بنا دیں۔ ہماری پیدائش کا مقصد یہی ہے۔ ہماری پیدائش کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ اگر کوئی اور مقصد ہے پیدائش کا تو تم بتاؤ، ساری دنیا کے کفار کو چیلنج ہے۔ قرآنی فیصلہ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورۃ الذریت: آیت 56)

یعنی: اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔

(باقی صفحہ نمبر: ۵۸)

تحریک تجدّد کا پس منظر اور اس کی فکری بنیادیں (۳)

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ

ایک زمانے میں دارالعلوم کے اساتذہ کرام ہر جمعرات کو کسی ضرورت کے موضوع پر اپنا کوئی لکھا ہوا مقالہ اساتذہ اور طلبہ کے اجتماع میں پیش فرماتے تھے، صدر وفاق؛ رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے یکم ستمبر ۱۹۶۴ء کے ایک ایسے ہی اجتماع میں اس اہم موضوع پر زیر نظر مقالہ پیش فرمایا تھا، اجتماع کی صدارت حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی۔ افادۂ عام کے لئے اس مقالے کی تیسری قسط ماہنامہ ''وفاق المدارس'' میں پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

مستشرقین کی طرف سے تجدد کی ہمت افزائیاں

اب ہم چند مستشرقین کے وہ اقوال آپ کے سامنے پیش کریں گے جن سے آپ کو یہ معلوم ہو کہ اہل مغرب تجدد کی تحریکوں کی کس طرح پیٹھ تھپکتے رہے ہیں، اور وہ کون ہے جو تجدد کی تحریکوں کو مسلسل ابھار رہا ہے؟ اور کس کے افکار اس تحریک کی پشت پر کام کر رہے ہیں؟......

مستشرقین کا عام طرز عمل یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں جتنی تحریکیں تجدد اور اسلام کو بگاڑنے کے لئے اٹھتی ہیں، وہ ان کی تائید اور ہمت افزائی ہی نہیں کرتے، بلکہ ان کو راہِ عمل سمجھاتے ہیں، کینڈا کے مشہور سر برآوردہ مستشرق پروفیسر ولفریڈ کنٹول اسمتھ کی کتاب Modern Islam of India کے بہت سے حوالے آپ پیچھے سن چکے ہیں، انہوں نے ہندوستان کی مذہبی، سیاسی، اور سماجی تحریکات پر جو کتاب لکھی ہے، اس میں یہ طرز عمل بہت نمایاں ہے کہ وہ ہر تجدد کی تحریک کی حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں، مگر جب اسلام کے احیاء کی کسی تحریک کا ذکر آتا ہے تو ان کے انداز سے ایک قسم کا انقباض مترشح ہوتا ہے، اور وہ اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، چنانچہ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک جہاد کو ''وہابی'' سے تعبیر کرنے کے بعد اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پہلی رجعت پسندانہ تحریک ہمارے مطالعہ کی حدود سے باہر ہے، یہ نویں صدی کی ابتداء میں شروع ہوئی، اور یہ صرف نچلے درجے کے لوگوں میں پروان چڑھی، یہ تحریک ایک پر جوش اور منظم احتجاج تھا، مگر اس کے پاس کوئی

تعمیری پروگرام نہ تھا جو کہ اس سطحیت کا مقابلہ کرسکتی جو سوسائٹی میں ہر طرح چھا کر اسے زوال پذیر بنا چکی تھی، اس تحریک کو اکثر ''وہابی'' کہا جاتا ہے'' (ص ۳ مقدمہ)

ڈاکٹر اقبال مرحوم کو انہوں نے ایک پہلو سے ''جدت پسند'' اور دوسرے پہلو سے ''رجعت پسند'' قرار دیا ہے اور رجعت پسندی کے پہلو پر تنقید کی ہے۔ یہاں تک کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''پھر سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے آج کے طلباء کو ایک فرسودہ نظام کی دعوت دی، بلکہ اس پر اصرار کیا، وہ پرانے نظام کو ایک جدید انداز میں پیش کررہے تھے، لیکن اس میں نہ کوئی محبت کا جذبہ تھا نہ کوئی تخلیقی مقصد تھا اور نہ ان مسائل کا کوئی حل جس کا طلباء مقابلہ کررہے تھے، یہ بالکل واضح ہے کہ وہ اسی پرانے مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو جاہل، بے صبرے اور ضدّی مذھبیوں کا مکتبِ فکر ہے'' (Modern Islam of India,p:151)

مگر تجدّد کے مکتبِ فکر کی تائید اور ہمت افزائی کرنے میں وہ بھی دوسروں کی طرح پیش پیش ہیں، حالانکہ مستشرقین میں اسمتھ صاحب شاید سب سے زیادہ غیر جانبداری کے مدعی ہیں، وہ صرف متجددین کی ہمت افزائی ہی نہیں کرتے، بلکہ انہیں اپنے موقف کی دلیلیں بھی سمجھاتے ہیں، لاہور مذاکرہ میں انہوں نے جو مقالہ پڑھا تھا، اس میں وہ لکھتے ہیں:

''حال کے انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے بزرگوں یا ماضی کے انسانوں کی غلطیوں کی تصحیح کرے، اور مجتہد کا فرض ہے کہ وہ اپنے زمانے کی اسی طرح خدمت بجالائے جس طرح اس کے بزرگوں نے اپنے دور کے لئے کی، لوگ اس شاندار عظیم کارنامے کی قدر کرتے ہیں اور تحسین وستائش کے پھول برساتے ہیں''۔

مگر اس پر عام طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم بزرگوں کی طرح اجتہاد کے اہل نہیں، اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''یہ کہنا کہ ہم اپنے بزرگوں کی طرح کام نہیں کررہے ہیں، کام نہ کرنے کا جواز نہیں بن سکتا، بیسویں صدی کا قانون انیسویں صدی کے قانون کی طرح مناسب حال نہ ہو لیکن وہ یقیناً انیسویں صدی کے مقابلے میں اپنے دور کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوگا، یہی دلیل کام پر اکسانے کے لئے کام میں لائی جاسکتی ہے''۔ (مقالہ بہ عنوان ''اسلام میں قانون اور اجتہاد'' ص ۶ و ۷)

اس سے زیادہ واضح طور پر ایک اور مستشرق جناب روڈی پیرٹ اپنے مقالہ ''عصر حاضر میں اسلام کے

تشریعی مسائل''میں لکھتے ہیں:

''اسلام کی شریعت اپنی مروجہ صورت میں عصر حاضر کی زندگی کی ضروریات کے لئے ہر اعتبار سے مکتفی نہیں''۔

اس کے بعد وہ تجدّد پر زور دیتے ہوئے صاف طور سے لکھتے ہیں کہ:

''یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مناکحت کے قانون اور اوقاف کے قانون میں بعض اصلاحات کیوں نہ کرلی جائیں؟ جبکہ ان اصلاحات کے لئے معقول وجوہ موجود ہوں، اور وہ اصلاحات عامۃ الناس کی بہبود پر منتج ہونے والی ہوں، کوئی تشریعی نظام ابدالاباد تک کے لئے تخلیق نہیں ہوا''۔

پھر کچھ مسائل میں بعض اسلامی ممالک نے تحریف کو اصلاح کا نام دیکر قوانین وضع کئے ہیں، ان پر بیحد مسرّت کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ان اصلاحات کا نفاذ اس امر کا ثبوت ہے کہ دنیائے اسلام میں نشأۃ ثانیہ اور تنظیم جدید کا دور شروع ہو چکا ہے، اور ہم بیسویں صدی کے مستشرقین خوش قسمت ہیں کہ اس دور کی طلوع سحر کو دیکھنے کے لئے زندہ ہیں، ہم حیرت اور استعجاب کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ ایک ایسی چیز معرض ظہور میں آ رہی ہے جسے آج سے پچاس سال پہلے ناممکن الوقوع خیال کیا جاتا تھا''۔

پھر پاکستان میں ان اصلاحات کو جلد نافذ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ تحریک ترقی پذیر ہے اور ممکن بلکہ اغلب طور ممکن ہے کہ عمر میں سب سے چھوٹی لیکن رقبے میں سب سے بڑی اسلامی ریاست پاکستان میں بھی شرع اسلام کے اہم ترین صفوں میں اصلاحات رائج کرنے کا معاملہ جلد ہی زیر غور لایا جائے گا''۔

اس کے علاوہ ایک اور مشہور مستشرقہ محترمہ ویرا مکالسن ڈین اپنی کتاب (The Nature of The Non-Western World) میں تحریر کرتی ہیں:

''اسلام کو ابھی تک کسی ایسی ذھنی تبدیلی کا تجربہ نہیں ہوسکا جو یورپ کی اصلاحات کے مشابہ ہو، لیکن ہمارے زمانے میں اگر اسلام یہ نہیں چاہتا کہ عرب کے جدت پسند نوجوان اُسے رد کردیں تو اسے اس قسم کی اصلاحات سے گذرنا پڑے گا''(ص ۵۰ وص ۵۱)

(as Quoted by Prof Khurshid in his article :islam and the west ,p:44)

ہمارے پاس مستشرقین کے اس قسم کے اقوال کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ وہ ایک مستقل کتاب بن سکتی ہے، مگر ہم یہاں مضمون کو طول نہیں دینا چاہتے، البتہ صرف ایک اور اقتباس سنتے جایئے،

ڈاکٹر فری لینڈ کے ایبٹ جو امریکہ کے مشہور مستشرق ہیں، اور پاکستان کی ذہنی تحریکات پر ایک کتاب لکھنے کے لئے ڈھائی تین سال یہاں رہ چکے ہیں، وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ جب تک جدت پسندوں کے نقطہ نظر سے جب تک مضامین قرآنی کو الگ الگ اجزاء وحصص کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے (Unless Quran Is Treated In Fragments) یا اس کی آزادخیالی کے ساتھ تعبیر وتفسیر نہ کی جائے، موجودہ زمانے میں اسلام کو ایک عقلی نظام کے طور پر پیش کرنا ممکن نہ ہوگا، قرآن میں کافی حصہ بے معنی معلوم ہوتا ہے، یا اس کے معنی صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک کے عربوں تک محدود نظر آتے ہیں، اسی لئے ان لوگوں کے لئے جو اسلام کی عقلیت کے علمبردار ہیں، قرآن میں بیان کردہ عام اصولوں پر زیادہ زور دینا ضروری ہے، مجملاً یہی وہ کام ہے جسے خلیفہ عبدالحکیم نے سرانجام دینے کی کوشش کی ہے، یہی وہ کام ہے جس کے لئے غلام احمد پرویز کوشش کررہے ہیں یہی رجحان شعوری طور پر یا غیرشعوری طور پر پاکستان کے اکثر مسلمانوں کا ہے۔

جب تک قدامت پسند اسلام میں جدت پسند تحریکوں کو مغرب کے اثر کی ایک بگڑی ہوئی شکل سمجھتے رہیں گے وہ ہمیشہ ناکام رہیں گے، اور ساتھ ہی وہ اسلام کی عقلی میراث کو جو اپنے اندار بڑی وسعت رکھتی ہے، اپنی فطری وسعت سے محروم کردیں گے''۔ (ماہنامہ چراغ راہ نظریہ پاکستان نمبر ص ۲۷۳)

اس عبارت میں ڈاکٹر ایبٹ نے پوری صاف گوئی کے ساتھ نہ صرف یہ بات واضح کردی ہے کہ ان کا پسندیدہ طرزفکر کونسا ہے، بلکہ ساتھ ہی متجددین کو ایک وسیع میدان تحریف بھی دکھلا دیا ہے انہوں نے کس قدر صفائی کے ساتھ یہ مشورہ دیا ہے کہ قرآن کو ایک کل کی حیثیت سے لینے کی بجائے اس کو اجزاء وحصص کرکے دیکھا جائے، اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر تحریف قرآن کی عمارت بڑی آسانی سے کھڑی کی جاسکتی ہے، اگر ایک آیت کو دوسری تشریعی آیات یا احادیث سے الگ کرکے دیکھا جائے، تو بات کے کہیں سے کہیں پہنچنے میں کیا دشواری رہ جاتی ہے؟ اب ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ایبٹ صاحب کو اس بات سے کیا بحث ہوسکتی ہے کہ یہ طرز عمل أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کی روشنی میں انسان کو کہاں پہنچاتا ہے؟

لیکن اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کی یہ دیدہ دلیری قابل داد ہے کہ وہ باوجود پاکستانیوں کو قریب سے دیکھنے کے

یہ فرماتے ہیں کہ ان میں سے اکثر کا وہی رجحان ہے جو پرویز صاحب پیش کرتے ہیں،

اس ارشاد کی روشنی میں آپ ملاحظہ فرماسکتے ہیں کہ ان حضرات کی غیر جانبداری کا وہ ''معصوم'' دعویٰ کہاں تک درست ہے، جس کا راگ یہ حضرات صبح وشام الاپتے ہیں؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مستشرقین کس جوش وخروش کے ساتھ تجدّد کی تحریکوں کا خیر مقدم کرتے رہے ہیں؟ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ کیا اس لئے کہ وہ اسلام کو ایک سچّا مذہب مانتے ہیں، اور اس لئے انہیں اس کی ترقی کی فکر ہے؟ اگر ایسا ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ خود ایسے سچّے مذہب کو قبول کر کے اس میں یہ ترمیمیں کیوں نہیں فرماتے؟...... پھر اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ تجدّد کا طبقہ ان کے دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی کرتا ہے، جو بات وہ مغرب میں کہتے ہیں، طبقہ اسے مشرق کے اس سرے سے اُس سرے تک پھیلا دیتا ہے، بہر کیف! ہم ان تمام مستشرقین کے تہ دل سے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے اس عام احساس کی کھل کر تائید کردی ہے کہ تجدّد کا مکتب فکر ہماری زمین کی پیداوار نہیں ہے، اس کی فکر خالص مغرب سے مستعار ہے، اور یہ جو کچھ کہتا ہے اس کا حال بقول اکبر مرحوم یہ ہے کہ ؎

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں ، زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں ، چراغ میرا ہے رات ان کی

تجدد کے فکر کی بنیادی لغزشیں:

تجدّد کی تحریک میں جو حضرات سرگرم عمل رہے ہیں، ان میں سے بعض تو وہ ہیں کہ ان کا حال قرآن مجید کی زبان میں یہ ہے کہ {رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا} ایسے انسانوں کے لئے تو کوئی دلیل نہ کبھی کارگر ہوئی ہے، نہ آئندہ ہوسکتی ہے، مگر بعض وہ حضرات ہیں جو فی الواقعہ غلط فہمی سے اس تحریک کے ساتھ شامل ہوئے ہیں، اس لئے ہم ان کی خدمت میں پوری ہمدردی اور خلوص کے ساتھ ان بنیادی لغزشوں کی نشان دہی کر رہے ہیں جو تجدّد کے فکر میں پائی جاتی ہیں،

ا...... گذشتہ صفحات میں ہم نے جو تجدّد کے ارتقاء کی ایک مختصر تاریخ پیش کی ہے اس سے بخوبی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ حضرات سب سے زیادہ مغربی تہذیب سے مرعوب ہیں، اور اسے ترقی کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں، اور ان کا یقین یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں اسے اختیار کئے بغیر کسی قوم کا زندہ رہنا ممکن نہیں، چنانچہ ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب اپنے مقالہ ''جدید افکار اور معاشرتی اقدار کی طرف سے اسلام کو چیلنج''، میں لکھتے ہیں:

''یہ مصلح (یعنی تجدد پسند) ان اقدار کو (یعنی مغربی اقدار کو) خیر مطلق سمجھتے تھے، اور ان کی ترقی پسندانہ نوعیت پر یقین رکھتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ انہیں اسلام پر بھی گہرا اعتقاد تھا، اسلام اپنے عہد زریں میں ایک ترقی پسند قوت تھی، اور چونکہ یہ اقدار جو آج ترقی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور معاشرتی خیر کی حامل ہیں، انہیں نہ صرف اسلام کی روح کے مطابق ہونا چاہئے بلکہ حقیقت میں اس کے معاشرتی پیغام کا حامل اور علمبردار ہونا چاہئے''۔ (ص ۲)

لیکن مغرب پر اس قدر غلو آمیز اعتقاد سر سید احمد خان صاحب کے زمانے میں ہوتا تو کسی درجے میں قابل معافی تھا، کیوں کہ اس وقت تک مغربی معاشرہ اپنے دور طفولیت میں تھا، اور اس کے پورے نتائج وثمرات سامنے نہ آئے تھے، لیکن آج تو مغربی نظام کی چمک دمک کا طلسم ٹوٹ چکا ہے، زندگی کے ہر شعبے میں یہ نظام اس حد تک ناکام ہو چکا ہے کہ خود اہل مغرب چیخ اٹھے ہیں، آج ہر شخص کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے کہ شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم کی یہ پیشگوئی کیسی حرف بہ حرف صحیح ہو رہی ہے کہ ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یہ حقیقت اب کسی اہل علم سے پوشیدہ نہیں رہی، یقین نہ آئے تو ہم یہاں صرف ایک حوالہ پیش کرتے ہیں، دور حاضر کے مشہور برطانوی مفکر اور فلسفی برٹرینڈ رسل کا ایک مضمون حال ہی میں شائع ہوا تھا جو ہر مسلمان بلکہ ہر مشرقی انسان کے لئے سرمۂ بصیرت ہے، اس مضمون کا نام ہے ''مشرق کی دوبارہ بیداری پر کچھ تاثرات'' اس میں ایک جگہ رسل صاحب فرماتے ہیں:

''مشرق کی ترقی کو اگر کوئی زبردست خطرہ ہے تو وہ مغرب کی اندھی تقلید کے اس رجحان سے ہے جو وہاں برابر بڑھ رہا ہے، میں بڑے خلوص کے ساتھ اہل مشرق کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ ان کے پاس معاشرت کے زیادہ اچھے طریقے ہیں، وہ ہرگز ان غلطیوں کا اعادہ نہ کریں جنہوں نے مغرب کو تباہی کے کنارے تک پہنچا دیا ہے، (از ماہنامہ ٹائمز آف پاکستان اشاعت جولائی ۱۹۵۶ء)

اگر یہ بات ہم ازخود کہتے تو اسے ''ملائیت'' کے نام پر رد کر دیا جاتا، لیکن یہ تو برطانیہ کے اس مفکر کا قول ہے جس کی انسانیت پسندی، غیر جانبداری اور معاملہ فہمی کا لوہا پوری دنیا میں یہاں تک کہ روس میں بھی مانا جاتا ہے، اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص مغربی نظام کا شیدائی ہو تو اس کا مرض ناقابل علاج ہے۔

۲......پھر اگر کوئی شخص اپنے دل سے مجبور ہو کر مغربی تہذیب کو اختیار کرنا چاہتا ہو، تو اسے چاہئے تھا کہ وہ خود یہ شوق پورا کر لیتا، لیکن تجدد پسند طبقہ دوسری غلطی یہ کرتا ہے کہ اسے اسلام کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے، حالانکہ اسلامی نظام اور مغربی نظام اپنی روح کے اعتبار سے اس قدر متضاد چیزیں ہیں کہ کسی اہم نقطے پر ان کا اجتماع ممکن نہیں، دونوں میں اقدار اور قیمتوں کا زبردست فرق ہے، جس چیز کو اسلام قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ مغرب میں بے قیمت ہے، اور جسے مغرب گراں قدر سمجھتا ہے وہ اسلام کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتی، اعتقادیات میں اسلام کا تصور یہ ہے کہ مذہب زندگی کا قانون ہے، اور مغرب میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہیں، اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور وہاں سرے سے اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں، اسلام کا پورا نظام تہذیب وحی ورسالت کے اعتقاد پر قائم ہے، اور وہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے، اسلام میں عقیدہ آخرت پورے نظام قانون واخلاق کا سنگ بنیاد ہے، اور وہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے، قانون میں اسلام یہ کہتا ہے کہ خود خدا واضع قانون، رسول شارح قانون اور انسان متبع قانون ہے، مگر وہاں خدا کو وضع قانون کا کوئی اختیار ہی نہیں، لیجسلیچر ی واضع قانون ہے اور قوم اسے منتخب کرتی ہے، سیاسیات میں اسلام کا مطمح نظر حکومت الٰہی ہے، اور مغرب کا مطمح نظر حکومت قومی، اسلام کا رُخ رنگ ونسل کی تفریق سے آزاد ہونے کی طرف ہے، اور مغرب کا کعبۂ مقصود قومیت ہے، معاشیات میں اسلام اکل حلال، زکوٰۃ اور تحریم سود پر زور دیتا ہے، اور مغرب کا سارا نظام ہی سود اور منافع پر چل رہا ہے، اخلاقیات میں اسلام کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے، اور مغرب کے سامنے دنیا کا فائدہ، اجتماعیات میں اسلام پاکیزگی، عفت اور ایثار کی تلقین کرتا ہے، اور مغرب کا پورا نظام ہی فحاشی بے حیائی، اور خود غرضی پر قائم ہے، غرض کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہیں جس میں اسلام اور مغرب مل کر بیٹھ سکتے ہوں، یہ دونوں درحقیقت دو مختلف سمتوں میں سفر کرنے والی کشتیاں ہیں، جن میں سے کسی ایک میں بیٹھنے کے بعد دوسرے میں بیٹھنے کا تصور مہلک ہے، اور جو ایسا کرنے کی کوشش کرے گا اس کے ٹکڑے اڑ جائیں گے۔

۳......تجدّد کے مکتب فکر کی تیسری بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام کی اصلی تعبیر کو اس کے اپنانے کے لئے ناقابل عمل سمجھتا ہے، لیکن یہ وہ سفید جھوٹ ہے جس کی نشر واشاعت اہل مغرب نے اگرچہ اس شدت کے ساتھ کی ہے کہ دنیا اسے سچ جاننے لگی، مگر اس کے باوجود یہ جھوٹ ہی ایسا شرمناک جھوٹ ہے کہ شاید اس سے بڑھ کر کوئی جھوٹ اس آسمان کے نیچے نہ بولا گیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کا کوئی تقاضا ایسا نہیں ہے، جو اسلام پر ٹھیک ٹھیک عمل کر کے پورا نہ کیا جا سکتا ہو، آج اگر صنعت وحرفت کی ترقی کا زمانہ ہے تو اسلام آپ کو اس میں آگے بڑھنے سے نہیں روکتا، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے، آج اگر سائنس کے عروج کا دور ہے تو اسلام آپ کو غباروں میں اڑنے یا چرخ پر جھولنے سے منع نہیں کرتا، بلکہ اس کے لئے ایک مفید استعمال بتا دیتا ہے، آج اگر آپ کو تحقیق واکتشاف کا ذوق ہے تو اسلام آپ کے اس ذوق کی قدر کرتا ہے، بلکہ اس ذوق کے لئے ایک صحیح رخ اور بہتر فضا مہیا کر دیتا ہے، آج اگر مدنیت کی آراستگی کا رجحان ہے، تو اس رجحان پر بھی وہ قدغن نہیں لگاتا، بلکہ اس کے لئے ایک معقول حد مقرر کر دیتا ہے، پھر بتلائیے کہ وہ کونسے زمانے کے تقاضے ہیں جنہیں اسلام کی قدیم اور اصلی تعبیر پورا کرنے سے قاصر ہے؟ ہاں اگر آپ زمانے کے تقاضوں کا مفہوم صرف رقص وموسیقی، بے پردگی وعریانی، سرمایہ داری اور سینما بینی کو سمجھتے ہیں، تو اسلام بیشک ان چیزوں سے روکتا ہے، لیکن غور تو فرمائیے کہ یہ چیزیں زمانے کا تقاضا کیسے ہیں؟ پہلا اعتقاد تو یہ ہے کہ اس زمانے کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو ممنوع کر دیا جائے، اس لئے کہ ان اشیاء کی ہلاکت آفرینیاں جس قدر اس زمانے میں واضح ہوئی ہیں، تاریخ کے کسی دور میں نہیں ہوئیں۔

پھر اس کے بعد جب اسلام کی قدیم تعبیر پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے تو وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق نہیں تو ہم اس کے سوا اور کیا کہیں کہ ؎

وہ بات میرے فسانے میں جس کا کوئی ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بڑی ناگوار گذری ہے

۴.....تجدّد کے مکتب فکر کی چوتھی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی بیشتر اسلامی معلومات کا دار و مدار مستشرقین کے اقوال پر رکھتا ہے، اور ان کی تقریبا ہر بات کی پورے خلوص کے ساتھ تقلید کرتا ہے، حالانکہ اسلام کے بارے میں مستشرقین کا رویہ اس قدر مخدوش ہے کہ اس پر ''دودھ کی رکھوالی بلّی'' کی مثل صادق آتی ہے،

ہم ذیل میں مستشرقین کا ایک مختصر تعارف پیش کرتے ہیں جس سے آپ کو ان کی اصلیت معلوم کرنے میں سہولت ہوگی:

مستشرقین:

یہ اہل علم کا وہ بدنصیب گروہ ہے جو اسلامی علوم کے سمندر میں بار بار غوطے لگانے کے باوجود ہمیشہ تشنہ کام لوٹتا ہے، ہمیں یہ اعتراف کرنے میں ذرا تامّل نہیں کہ مستشرقین اسلامی موضوعات پر لکھنے میں بے انتہا محنت کرتے ہیں،

بلکہ شاید اس قدر محنت خود مسلمان اپنے مذہب کی تحقیق میں نہ کرتے ہوں، اور یہ ان سے ایک سبق لینے کی چیز ہے، لیکن جہاں تک ان کی باتوں کے علمی وعقلی وزن کا تعلق ہے، تو ہم پوری دیانتداری کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کی باتوں کا علمی وعقلی اعتبار سے کوئی وزن نہیں ہوتا، جس موضوع پر انہیں کچھ لکھنا نہ ہو، اس موضوع کی تو وہ بہت سی بنیادی چیزوں سے یکسر غافل ہوتے ہیں، ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

پروفیسر ڈیوڈ، ڈی، سانٹی لان (David De Santi Lawn) ایک مستشرق ہیں، ان کا ایک مضمون مشہور کتاب (The Legacy of Islam) میں چھپا تھا، اور اس کا اردو ترجمہ ماہنامہ چراغ راہ کراچی کے اسلامی قانون نمبر میں شائع ہوا، جس کا عنوان ہے ''اسلامی قانون اور نظام معاشرت'' اس میں انہوں نے اپنے موضوع پر خاصی محنت کر کے مقالہ لکھا ہے، مگر ایک جگہ فرماتے ہیں:

''یہ سب خیالات اسلام کی قدیم ترین تاریخی دستاویز یعنی اس فرمان خداوندی (قرآن) میں پیش کئے گئے ہیں جس کا نزول ۱ھ میں مدینۃ النبیؐ میں ہوا، (اسلامی قانون نمبر ص۱۷ج۱)

ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ قرآن کا نزول مکہ مکرمہ میں ہجرت سے تیرہ سال پہلے شروع ہو چکا تھا، مگر یہ نئے مؤرخ ۱ھ اس کی تاریخ قرار دیتے ہیں۔

اور ملاحظہ فرمایئے، پروفیسر اسمتھ صاحب جن کا ذکر پہلے بھی کئی بار آچکا ہے، اپنے ایک مقالے ''اسلام میں قانون اور اجتہاد'' میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''حدیث میں ہے کہ **تتغیر الاحکام بتغیر الزمان**'' (ص۵)

فقہاء ومحدثین پر تو یہ الزام تھا کہ انہوں نے حدیث کی معاذ اللہ کما حقہ حفاظت نہ کی، اور بہت سی غلط چیزیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب فرمادیں، مگر یہ ان نئے فقیہ ومحدث کا کارنامہ سب سے زیادہ قابل داد ہے جو فقہاء کے ایک مقولے کو حدیث قرار دے رہے ہیں، غرض کہنا یہ تھا کہ یہ لوگ اپنے وسیع مطالعے اور سخت محنت کے باوجود بعض اوقات انتہائی عقلانہ غلطیاں بھی کر جاتے ہیں،

ان حضرات کے طرز تحقیق کی دوسری زبردست اور بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ بیحد محنت کرنے کے بعد اپنے مدّعا پر جو دلیلیں لاتے ہیں، ان میں کوئی ٹھوس بات نہیں ہوتی، وہ ہر چیز کی ایک عجیب ارتقائی تعبیر اختیار کرتے ہیں، اور تاریخی وادبی مواد کو جمع کرنے کے بعد چند جزئیات سے ایک کلیہ مستنبط کر لیتے ہیں، جو اصول استدلال کی بنیادی غلطی ہے، یہ رائے ہم نے سرسری طور سے یونہی قائم نہیں کر لی ہے، بلکہ ان کے مضامین ومقالات اور کتابوں کا ایک

گہرے مطالعے نے ہمیں اس نتیجے تک پہنچایا ہے، کم وبیش ان کے ہر مقالے میں یہی انداز نظر آتا ہے، یہاں ہم اس کی ایک دو مثالیں دیں گے۔

بہت سے مستشرقین مثلاً مسٹر گولڈزیہر (Goldziher) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پورا فقہ اسلامی روما کے قانون سے مأخوذ ہے، اس پر انہوں نے مندرجہ ذیل دلیلیں پیش کی ہیں

۱......فقہ اسلامی کے اور قانون روما دونوں کے بعض قوانین میں مماثلت ہے، یہاں تک کہ بعض قوانین من وعن وہی ہیں، جیسے یہ کلیہ کہ "البینة علی المدعی و الیمین علی من أنکر"

۲......بعض علمی اصطلاحات دونوں میں مشترک ہیں، مثلاً لفظ ''فقہ'' کو قانون کے معنی میں لینا، یہ دراصل لفظ Gurics سے مأخوذ ہے، جس کو اہل روما استعمال کرتے ہیں اور جو فہم ومعرفت اور حکمت کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔

۳......اسلامی فتوحات کے وقت قیصریہ اور بیروت میں قانون روما کے مدارس تھے، اور بعض عدالتیں اسی قانون کے مطابق عمل کرتی تھیں، لہٰذا لازم ہے کہ جو قوم پہلے مدنیّت سے بے تعلق رہی ہو، روما کے ان قانونی اداروں سے متاثر ہوئی ہوگی، (فجر الاسلام از احمد امین مصری ص ۲۴۶ و ۲۴۷)

ڈاکٹر بروکلمان جو مشہور مستشرق ہے، تاریخ الادب العربی میں لکھتا ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی فتوحات کی وسعت کے بعد مسلسل مدنی ضروریات میں اضافہ ہو رہا تھا، اور قرآن وسنت کا محدود ذخیرہ اس کے لئے ناکافی تھا، اس لئے لازماً مسلمانوں نے قوانین روما سے اخذ کئے ہوں گے،

۴......اسلامی فقہ ایک بہت مختصر مدت میں مدون ہو گیا ہے، اور اس قدر کم وقت میں اتنا بڑا ذخیرۂ قانون مدون نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ وہ بیرونی اثرات سے متأثر نہ ہو،

۵......ایک صاحب نے تو نہایت عجیب استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ افسوس امام اوزاعیؒ کا مرتب کردہ فقہ ضائع ہو گیا، ورنہ اس میں ضرور اس بات کی مزید دلیلیں ہوتیں، ان حضرات نے مندرجہ بالا مشابہتوں اور قیاسات کو ثابت کرنے کے لئے تو حوالوں کی بھرمار لگا دی ہے، لیکن یہ نہ سوچا کہ ان باتوں سے اس بات کا قطعی علم کیسے حاصل ہو گیا کہ اسلامی فقہ قانون روما سے ماخوذ ومستنبط ہے، عقلیّت کا فقدان ملاحظہ ہو کہ دعویٰ تو ایک کلیے کے طور پر کیا جا رہا ہے اور دلیل میں جزئیات وقیاسات ہیں۔ آپ مستشرقین کی چھان بین کر لیجئے، آپ کو ہر جگہ کم وبیش یہی طرز استدلال نظر آئے گا، وہ اپنے ذہن میں ایک مفروضہ فرض کر کے متعلقہ زمانے کی تاریخ وادب کا گہرا مطالعہ

کریں گے، اوراس میں جو جزئیات مفید مطلب نظر آئیں گے انہیں خوب بنا سنوار کر یکجا جمع کردیں گے، اور پھر کہیں گے کہ دیکھو تحقیق سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

وہ ہر مسئلے پر اسی عجیب زاویے سے نگاہ ڈالتے ہیں، انہوں نے دور جاہلیت کے ادب کا مطالعہ شروع کیا تو یہ خیال ذہن میں پیدا ہوگیا کہ اسے دور جاہلیت کا ادب نہیں ہونا چاہئے، بس ان کے ذہن میں یہ بات پک گئی کہ ہونہ ہو یہ حمّاد الرّاویۃ کا گھڑا ہوا ادب ہے جسے اس نے جاہلیت کی طرف منسوب کردیا ہے، اس مفروضے کو ذہن میں رکھ کر انہوں نے چھان بین کی تو انہیں چند مثالیں مل گئیں جن میں بعض لوگوں نے خود شعر کہہ کر امرؤالقیس اور طرفہ کی جانب منسوب کردیئے تھے، چنانچہ ان مثالوں کو جمع کرکے انہوں نے استدلال کی ایک عمارت کھڑی کردی کہ یہ جاہلیت کی طرف جو ادب منسوب ہے، وہ پورا کا پورا گھڑا ہوا ہے، لہٰذا اس سے استدلال کرکے قرآن کریم کے جتنے مضامین کی تفسیر کی گئی ہے، وہ بھی غلط، اوراس کے ذریعے قدیم لوگوں کی شدید قوت حافظہ پر جو استدلال کیا گیا ہے، اوراس سے حفظ حدیث کی جو تائید کی گئی ہے، وہ بھی بے بنیاد ہے،

اس مسئلے کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محمد احمد الغمر اوی کی فاضلانہ کتاب ''**النقد التحليلي على الأدب الجاهلي**، اوراس پر امیر شکیب ارسلان کا مقدّمہ **الشعر الجاهلي، أمنحول أم صحيح النّسبة**؟۔

دورحاضر کے بعض مستشرقین مثلاً پروفیسر جے شاخت اور پروفیسر اسمتھ یہ ثابت کرنے پر مُصر ہیں کہ جس سنّت کو اسلامی قانون کا ماخذ قرار دیا گیا ہے، وہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال ہی نہیں ہیں، بلکہ عام مسلمانوں کے طرز زندگی پر بھی سنت کا اطلاق کیا گیا ہے، اس لئے اسلامی قانون عام رسم ورواج سے بھی مستنبط کیا گیا ہے، جس کی درحقیقت کوئی شرعی بنیاد نہیں، مسٹر جے شاخت لکھتے ہیں:

''جس قانون میں خلفاء اور ولاۃ کے احکام نیز مروجہ طریقے اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول پائے جائیں، ان سب کو سنت قرار دیدیا جائے''۔

اس پر دلیل کیا ہے کہ سنت مروجہ طریقوں کے معنی میں عام استعمال ہوتا تھا، اس لئے ''فقیہ اعظم'' جناب عبداللہ بن المقفّع (جن کے اسلام میں بھی شبہ ہی رہا) نے ایک خط خلیفہ منصور کو لکھا تھا، اس میں سنت کو جن معنوں میں لیا تھا، اس میں پہلی حکومتوں کے قوانین بھی شامل تھے،

یہ ہے ان حضرات کا طرز فکر اور اسلوب تحقیق، جس سے مرعوب ہوکر ہمارے متجددین ان میں اسلام کا سب سے بڑا محقق سمجھتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

اَحادیث قدسیہ!......ایک تعارف

مولوی محمد عمر رفیق

اَللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے دو سلسلے جاری فرمائے: ایک کتاب اللہ اور دوسرا رجال اللہ، جس میں دوسرا دَرحقیقت پہلے ہی کی تشریح وتوضیح کا وسیلہ اور ذریعہ ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام، اللہ تعالیٰ کے کلام کی وضاحت کے لیے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کلام وحی الٰہی ہی ہوتا ہے اس کی شہادت خود اللہ پاک نے اپنے کلام میں دی ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ (النجم: ۳، ۴)

ترجمہ: ''یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صاحب جوامع الکلم بنا کر بھیجا گیا، یعنی ایسی احادیث جو معانی کثیرہ پر مشتمل ہوں، چنانچہ حدیث میں وارد ہے:

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: فضلت علی الانبیاء بست: اعطیت جوامع الکلم... (مسلم، ج:۱، ص۱۹۹)

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مجھے تمام انبیاء علیہم السلام پر چھ وجوہات سے فضیلت دی گئی: مجھے جامع کلمات عطا کیے گئے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اَنفاس والفاظ مبارکہ کی ایک اعلیٰ وارفع قسم وہ احادیث ہیں جن کے معانی، اللہ تعالیٰ کے ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اَللہ تبارک وتعالیٰ سے روایت کرتے ہیں۔ اس قسم کی احادیث کو ''احادیث قدسیہ'' یا ''احادیث الٰہیہ'' یا ''اَحادیث ربانیہ'' کہا جاتا ہے۔

شیخ محمد عوامہ نے اپنی کتاب ''**من صحاح الاحادیث القدسیہ**'' کے مقدمے میں لکھا ہے کہ حدیث قدسی کی فضیلت یہ ہے کہ اس میں دو نور جمع ہیں: ایک نورِ الٰہی اور دوسرا نورِ نبوی، چونکہ یہ احادیث ایک حیثیت سے اللہ ہی کا کلام ہیں، اس لیے ترغیب وترہیب کی زیادہ تاثیر رکھتی ہیں، ان احادیث میں عموماً اللہ تعالیٰ کی صفات جلالیہ وجمالیہ یا اس کے مقربین فرشتے یا اللہ تعالیٰ کے اس کے بندوں کے ساتھ تعلق کا بیان ہوتا ہے۔ (ص۶، ۷۔ مکتبہ دار الیسر)

حدیث قدسی کی تعریف:

ا......علامہ سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۸۱۶ھ نے اپنی کتاب ''التعریفات'' میں حدیث قدسی کی تعریف یوں لکھی ہے:

الحدیث القدسی ھو من حیث المعنی من عنداللہ تعالیٰ و من حیث اللفظ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم، فھو مااخیر اللہ تعالیٰ بہ نبیہ با لھام او بالمنام فاخبر علیہ السلام عن ذلک المعنی بعبارۃ نفسہ فالقرآن مفضل علیہ لأن لفظہ منزل ایضا۔ (باب القاف ص: ۸۴، ط: دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

حدیث قدسی وہ حدیث ہے جس کے معانی ومفہوم اللہ کی طرف سے ہوں اور الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بصورت خواب یا الہام، اللہ نے القاء کیے ہوں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہو، البتہ قرآن کا درجہ اس سے بلند ہے کہ اس کے الفاظ بھی اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں۔

۲......علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الحدیث القدسی اخبار اللہ تعالیٰ نبیہ علیہ الصلاۃ و السلام معناہ بالھام او بالمنام، فاخبر النبی صلی اللہ علیہ و سلم عن ذلک المعنی بعبارۃ نفسہ۔ (الاتحافات السنیۃ بالأحادیث القدسیہ للمناوی، مقدمہ، ص: ۲ ط: دارالمعرفۃ بیروت، لبنان)

حدیث قدسی وہ خبر ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو الہام یا خواب کے ذریعہ دی ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو۔

۳......ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ حدیث قدسی کی تعریف میں فرماتے ہیں:

وقال ملا علی القاری علیہ رحمۃ الباری: الحدیث القدسی: مایرویہ صدر الرواۃ وبدر الثقات علیہ افضل الصلوات واکمل التحیات عن اللہ تبارک و تعالیٰ تارۃً بواسطۃ جبرائیل علیہ السلام و تارۃ بالوحی والالھام والمنام مفوضاً الیہ التعبیر بأی عبارۃٍ شاء من أنواع الکلام۔'' (ایضا، ص: ۳)

حدیث قدسی اسے کہتے ہیں جسے راویوں کے سردار اور ثقات کے منبع واصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہو، خواہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے واسطے سے، یا وحی، الہام یا خواب کے ذریعہ، جس کی تعبیر کا اختیار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا ہے، وہ جن الفاظ سے چاہیں بیان کریں۔''

۴......شیخ محمد عوامہ نے اس تعریف کو اختیار کیا ہے:

حدیث قدسی وہ صریح قول ہے جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ جل شانہ سے روایت کریں۔''

شیخ کی اس تعریف کو راجح قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ تعریف دیگر تعریفات کے مقابلے میں زیادہ اختصاص کی حامل ہے، اس لیے کہ اس میں حدیث قدسی کا قول باری تعالیٰ ہونا ضروری ہے، فعل باری کی حکایت اس سے خارج ہے اور قول بھی صریح ہو، ورنہ حدیث قدسی نہ ہوگی، جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اوحی الی انکم تفتنون فی قبورکم مثل او قریب من فتنۃ المسیح الدجال۔

(بخاری، ج:۱،ص،۱۴۴،قدیمی کتب خانہ)

ترجمہ: ''مجھے وحی کی گئی ہے کہ تم لوگوں کو تمہاری قبروں میں دجال کے فتنے جیسی سخت آزمائش ہوگی۔''

اس جیسی احادیث شیخ محمد عوامہ کے نزدیک حدیث قدسی نہیں۔

کیا حدیث قدسی کے الفاظ و معنی دونوں منجانب اللہ ہیں یا الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے استعمال کردہ ہیں؟

گزشتہ تعریفات سے ظاہر ہے کہ اکثر علماء کا رجحان دوسرے قول کی طرف ہے اور بعض علماء کے نزدیک حدیث قدسی کے الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں، گویا یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''**الفتح المبین فی شرح الأربعین**'' میں فرماتے ہیں:

''**اعلم ان الکلام المضاف الیہ تعالیٰ اقسام ثلاثۃ۔**''

ان کی مکمل عبارت کا خلاصہ:

جس کلام کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، اس کی تین اقسام ہیں:

۱: قرآن کریم: یہ سب سے اعلیٰ ہے اور صفت اعجاز سے متصف ہے۔

۲۔ انبیاء سابقین علیہم السلام کی کتب تحریف سے قبل۔

۳۔ احادیث قدسیہ: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اور غیر متواتر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نسبت اللہ کی طرف کی ہے، لہٰذا یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے۔ (الحدیث الرابع والعشرون، ص234، مکتبہ دار المنہاج)

''**الاتحافات السنیۃ**'' کے خاتمہ میں امیر حمید الدین کے فوائد میں قرآن کریم اور احادیث قدسیہ کے درمیان کئی فروق کے ضمن میں منقول ہے کہ:

''پانچواں فرق قرآن کریم اور احادیث قدسیہ کے درمیان یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ لازمی طور پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتے ہیں، برخلاف حدیث قدسی کے کہ اس میں جائز ہے کہ اس کے الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوں۔''

گویا حدیث قدسی کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے بھی ہو سکتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی۔ (خاتمہ،

ص:۱۹۰، الاتحافات السنیۃ لعلامہ محمد المدنی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ، ط: دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدر آباد دکن ۱۳۵۸)

بہر حال جمہور کا مذہب یہ ہے کہ الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی ہوتے ہیں، چنانچہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ ''مشکاۃ المصابیح'' کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

والحدیث القدسی: اخبار اللہ تعالیٰ نبیه علیه الصلاة والسلام معناه بالهام أو بالمنام فی خبر النبی صلی اللہ علیه وسلم عن ذلک المعنیٰ بعبارة نفسه۔ (ج:۱،ص:۱۴۸-۱۴۹)

''حدیث قدسی وہ حدیث ہے جس کے معنیٰ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو الہام یا خواب کے ذریعے بتائے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو تعبیر میں خبر دی۔''

اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ''**مرقاۃ المفاتیح**'' میں یہ فرماتے ہیں کہ:

''**الفرق بین القرآن والحدیث القدسی أن الأول یکون بالهام أو منام أو بواسطة ملک بالمعنی، فیعبره بلفظه وینسبه الی ربه والثانی لایکون الا بانزال جبریل علیه السلام باللفظ المعین۔**'' (ج:۱،ص۹۵)

''حدیث قدسی اور قرآن میں فرق یہ ہے کہ حدیث قدسی کے معانی الہام یا خواب یا فرشتہ کے ذریعے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائے جاتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے الفاظ سے اس کو بیان کرتے ہیں اور نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور قرآن معین الفاظ کے ساتھ جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے ہی نازل ہوتا ہے۔''

اور علامہ سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ (کمامر)

جمہور کے نزدیک احادیث قدسیہ کی نسبت اللہ کی طرف ایسی ہی ہے جیسے کہ کسی شعر کی وضاحت کرتے ہوئے یوں کہا جاتا ہے کہ شاعر کہتا ہے اور قرآن پاک کی کسی آیت کی تفسیر و معانی بیان کرتے وقت یوں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ نہیں ہوتے، اسی طرح احادیث قدسیہ میں معانی و مضمون تو اللہ کی جانب سے ہے اور تعبیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہے۔

اَحادیث قدسیہ اور قرآن کریم میں فرق:

گزشتہ تعریفات اور علماء کے اقوال کے نتیجہ میں قرآن اور حدیث قدسی میں چند فرق ظاہر ہوتے ہیں:

۱......قرآن کریم کے الفاظ معجز ہیں اور حدیث قدسی میں اعجاز نہیں۔

۲......قرآن کریم: جبریل علیہ السلام کے واسطے سے نازل ہوا، جب کہ احادیث قدسیہ بلاواسطہ بھی نازل ہوئیں۔

۳......قرآن کریم متواتر نقل ہوتا ہوا آیا ہے اور ہر قسم کی تبدیلی سے محفوظ ہے، جب کہ حدیث قدسی میں تواتر شرط نہیں۔

۴......قرآن کریم کی روایت بالمعنیٰ جائز نہیں اور حدیث قدسی کی جائز ہے۔

۵......قرآن کریم کو بلا طہارت چھونا جائز نہیں، نیز جنبی اور حائض کے لیے اس کی تلاوت جائز نہیں، جب کہ حدیث قدسی کے لیے یہ احکام علی اللزوم نہیں۔

۶......نماز میں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے، حدیث قدسی کی تلاوت نماز میں جائز نہیں۔

۷......احادیث قدسیہ کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بھی ہوتی ہے، جب کہ قرآن کریم کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔

۸......قرآن پاک کی کتابت دور نبوی میں ہوئی اور احادیث قدسیہ کی بعد میں ہوئی۔

۹......جمہور علماء کے نزدیک حدیث قدسی کے الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جب کہ قرآن کریم میں الفاظ اور معانی دونوں منجانب اللہ ہیں۔ (الاتحافات السنیۃ للعلامۃ محمد المدنی، خاتمہ، ص: ۱۸۷ تا ۱۹۰)

احادیث قدسیہ اور احادیث نبویہ میں فرق:

1......حدیث قدسی کی نسبت اللہ جل شانہ کی طرف ہی ہوتی ہے، جب کہ حدیث نبوی کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی طرف ہوتی ہے۔

۲......حدیث قدسی کے موضوعات عموماً خوف خدا، اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے کلام پر مبنی ہوتے ہیں، اور احکام تکلیفیہ شاذ و نادر ہی بیان ہوتے ہیں، جب کہ احادیث نبویہ میں احکام تکلیفیہ کا بیان زیادہ ہے۔

۳......احادیث قدسیہ کی تعداد احادیث نبویہ کی بنسبت بہت کم ہے۔

۴......احادیث قدسیہ محض قولیہ ہی ہوتی ہیں، جب کہ احادیث نبویہ قولیہ اور فعلیہ دونوں ہوتی ہیں۔

احادیث قدسیہ کے چند اہم مجموعے:

۱......"**المقاصد السنیة فی الأحادیث الالهیة**" یہ کتاب علامہ علاء الدین علی بن بلبان (المتوفی: ۶۸۴ھ) کی تصنیف ہے، جو ۱۴۰۸ھ میں مکتبہ دار التراث مدینہ منورہ اور دار ابن کثیر بیروت نے چھاپی ہے، اس میں کل سو احادیث جمع کی ہیں اور چند احادیث مناقب صحابہؓ اور حلیۂ رسول کے متعلق جمع کی ہیں۔

۲......علامہ ابن عربی الطائی المتوفی ۶۳۸ھ نے اپنی کتاب "مشکوٰۃ الانوار" میں ۱۰۱ اَحادیث قدسیہ نقل کی ہیں۔

۳...... علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ المتوفیٰ ۹۱۱ھ نے اپنی کتاب 'الجامع الصغیر' میں ۶۶ اور ''جمع الجوامع'' میں ۱۳۳ اَحادیث قدسیہ جمع کی ہیں۔

۴...... **الاحادیث القدسیۃ الاربعینۃ** اس رسالے میں ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ۴۰ اَحادیث جمع کی ہیں، یہ ۱۴۲۴ھ میں دارالبشائر الاسلامیہ بیروت سے، نذیر محمد مکتبی کی شرح ''**الروضۃ البھیۃ**'' کے ساتھ چھپی ہے، تمام احادیث کومختلف اجزاء میں تقسیم کیا ہے۔

۵...... **الاتحافات السنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ**، یہ علامہ محمد عبدالرؤف بن تاج العارفین المناوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۰۳۱ھ کی تصنیف ہے، اس میں ۲۷۲ احادیث ہیں اور صحیح وغیر صحیح ہر قسم کی احادیث ہیں۔ مکتبۃ التراث الاسلامی نے اس کو شیخ محمد منیر دمشقی کی شرح ''**النفحات السلفیۃ**'' کے ساتھ چھاپا ہے۔

۶...... **الاتحافات السنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ**، یہ محمد المدنی الحنفی المتوفی ۱۲۰۰ ہجری کی تصنیف ہے، اس میں کل ۸۶۳ / اَحادیث قدسیہ جمع کی گئی ہیں، جو کل تین ابواب پر مشتمل ہیں:

الف:...... لفظ 'قال' سے شروع ہونے والی احادیث۔

ب:...... لفظ 'یقول' سے شروع ہونے والی احادیث۔

ج:...... ان کے علاوہ دیگر احادیث۔

۷...... **الاحادیث القدسیۃ**، یہ کتاب **المجلس الاعلی لشؤن الاسلامیہ مصر** کے ارکان نے مرتب کی ہے، اس کتاب میں تقریباً ۴۰۰ اَحادیث کو جمع کیا گیا ہے، اور صحاح ستہ اور موطا امام مالک کی تخریج کی ہے، لیکن شیخ محمد عوامہ نے ان کی تالیف پر کئی اعتراضات کیے ہیں۔

۸...... مقدس باتیں، ترجمہ 'الاحادیث القدسیۃ' یہ مصطفیٰ عدوی کی تالیف ہے، اس میں ۱۸۵ اَحادیث قدسیہ صحیحہ کو جمع کیا ہے، دارالصحابہ للتراث نے چھاپی ہے۔

۱۰...... **من صحاح الاحادیث القدسیۃ للشیخ محمد عوامہ**، مولف نے اس میں اپنی سخت شرط کے ساتھ ایک سو اَحادیث کو جمع کیا ہے، جو اکثر صحیحین کی روایتیں ہیں۔ شیخ نے تخریج اور شرح کے ساتھ ساتھ غریب الحدیث پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

۱۱...... **جامع الاحادیث القدسیۃ** جو عصام الدین الصبابطی کی تالیف ہے، مولف نے تبویب کے ساتھ ۱۱۵۰ اَحادیث جمع کی ہیں۔

۱۲...... ''خدا کی باتیں' مولانا سعید احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے۔

اساتذہ اور علماء کے ساتھ وفاداری

اسماعیل محمد عباس

آج ہم عمومی طور پر وفاداری کے بحران کا شکار ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وفاداری کا بحران، اپنی بیویوں اور اولاد کے ساتھ وفاداری کا بحران، اپنے والدین کے ساتھ وفاداری کا بحران، اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ وفاداری کا بحران، اپنی مساجد اور اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ وفاداری کا بحران، اور انہی میں سے ایک اپنے علماء اور مربیوں کے ساتھ وفاداری کا بحران بھی ہے۔

اسی لیے میں نے اس مقالے میں یہ بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے کہ شیوخ اور علماء کے اپنے شاگردوں، مستفیدین، سامعین اور متعلقین پر کیا حقوق ہیں؛ تاکہ ہم ان کے ساتھ وفاداری کا حق ادا کر سکیں۔ کیونکہ وفاداری نیک لوگوں کا وصف، پاکیزہ دلوں کا تاج اور باوفا لوگوں کا شعار ہے، جبکہ ناشکرے اور جاہل لوگ اسے بھلا دیتے ہیں۔

البتہ میری مراد ہر وہ شخص نہیں جو عمامہ باندھ لے، منبر پر چڑھ جائے یا محض ظاہری طور پر اپنے آپ کو عالم ظاہر کرے، جبکہ حقیقت میں وہ دنیا پرستی اور خواہشات کا شکار ہو۔ میری مراد ان علماء، خطباء اور طلبۂ علم سے ہے جو علم پر عمل کرنے والے، حق پر ثابت قدم اور مخلص ہوں۔ شاعر نے خوب کہا ہے:

عِشْ ألفَ عامٍ للوفاءِ وقلَّما * سادَ امرؤٌ إلا بحفظِ وفائِهِ**

ہزار سال زندہ رہو وفاداری کے ساتھ، کیونکہ کوئی شخص وفاداری کو نبھائے بغیر عزت وسیادت حاصل نہیں کر سکتا۔

میں نہ کسی موقف کا دفاع کرنا چاہتا ہوں اور نہ کسی واقعے کی توجیہ پیش کرنا چاہتا ہوں، بلکہ صرف اپنے اس فرض کو واضح کرنا چاہتا ہوں جو ان لوگوں کے حق میں ہم پر عائد ہوتا ہے جن سے ہم نے علم سیکھا، جن کی نصیحتیں سنیں اور جن کی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ کیونکہ یہی لوگ اللہ کی طرف رہنمائی کرنے والے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں۔

1۔ اساتذہ وشیوخ کے لیے پسِ پشت دعا کرنا: یہ ان کے ساتھ وفاداری کی سب سے بڑی صورتوں میں سے ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب سے میرے استاد حماد کا انتقال ہوا، میں نے کوئی نماز ایسی نہیں پڑھی جس میں اپنے والدین کے ساتھ ان کے لیے استغفار نہ کیا ہو۔ بلکہ میں ہر اس شخص کے لیے دعا کرتا ہوں جس سے میں نے علم سیکھا یا جسے میں نے علم سکھایا۔''

امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں اپنی دعا میں اپنے والدین سے پہلے امام ابو حنیفہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔'' امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تیس سال سے کوئی رات ایسی نہیں گزری جس میں میں نے امام شافعی کے لیے دعا اور استغفار نہ کیا ہو۔'' ایسی مثالیں بے شمار ہیں۔

2۔ اساتذہ کی بعض ناگوار باتوں پر صبر کرنا: اگر کوئی شخص اپنے شیخ یا اپنے استاذ میں کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناگوار لگے یا اسے عیب محسوس ہو، تو اسے چاہیے کہ صبر سے کام لے اور اس کی دوسری خوبیوں اور خدمات کو بھی یاد رکھے۔ حضرۃ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میرے سخت لہجے سے مت بھاگو، کیونکہ مجھے بھی دین کے معاملے میں سختی سے تربیت دی گئی ہے۔ جو شخص مجھ جیسے لوگوں سے بھاگتا ہے، وہ کامیاب نہیں ہوتا۔''

ایک بزرگ نے فرمایا: ''جو شخص تعلیم حاصل کرنے کی ذلت کو ایک گھڑی برداشت نہیں کرتا، وہ ساری زندگی جہالت کی ذلت میں رہتا ہے۔''

ایک اور بزرگ نے فرمایا: ''ہماری بعض برائیوں کی وجہ سے ہماری اچھی باتوں کو قبول کرنے سے محروم نہ ہو جاؤ۔'' اور ایک نے کہا: ''جو شخص کسی عالم سے ناراض ہوجاتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مسجد کے ستونوں سے ناراض ہوجائے۔''

3۔ اساتذہ وشیوخ کا احترام اور توقیر کرنا: بغیر غلو اور مبالغے کے علماء کا احترام کرنا ضروری ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام ابن مہدی رحمہ اللہ کی مجلس میں لوگ اس قدر ادب سے بیٹھتے تھے کہ نہ کوئی گفتگو کرتا، نہ قلم تراشتا، نہ اپنی جگہ سے اٹھتا؛ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں یا جیسے نماز میں کھڑے ہوں۔ امام شافعی کے شاگرد ربیع رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''اللہ کی قسم! میں امام شافعی کی موجودگی میں پانی پینے کی بھی جرأت نہیں کرتا تھا، ان کی ہیبت کی وجہ سے۔''

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں چار سال تک ہشیم کے ساتھ رہا، لیکن ان کی ہیبت کے باعث صرف دو مرتبہ ان سے کوئی سوال کر سکا''۔

4۔ اساتذہ کی تحقیر اور کردارکشی سے بچنا: بعض مسلمانوں میں ایک خطرناک بیماری پیدا ہوگئی ہے کہ وہ معمولی لغزش یا کسی موقف کی وجہ سے علماء کی عزت گرانے لگتے ہیں اور ان کے علم وفتویٰ کو بے وقعت سمجھتے ہیں، جبکہ بعض اوقات ان کی طرف غلط باتیں منسوب بھی کر دی جاتی ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے تھے: آزاد اور شریف انسان وہ ہے جو ایک لمحے کی محبت کا بھی لحاظ رکھے اور اس شخص سے تعلق قائم رکھے جس نے اسے ایک لفظ بھی سکھایا ہو۔''

محمد بن واسع رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''بندہ اس وقت تک مقامِ احسان کو نہیں پہنچتا جب تک وہ ہر اس شخص کے

ساتھ حسنِ سلوک نہ کرے جس کی اسے کچھ دیر بھی صحبت ملی ہو۔'' حتیٰ کہ جب وہ کوئی بکری فروخت کرتے تو خریدار سے کہتے: ''اس کا خیال رکھنا، یہ کچھ عرصہ ہمارے ساتھ رہی ہے۔''

5۔ اساتذہ کے بارے میں نقل وروایت میں احتیاط: طالبِ علم کے لیے جائز نہیں کہ اپنے شیخ تک ایسی باتیں پہنچائے جو دلوں میں نفرت اور فساد پیدا کریں۔ اسی طرح اسے اپنے شیخ کی ہر بات دوسروں تک پہنچانے سے بھی گریز کرنا چاہیے، کیونکہ بعض باتیں شیخ صرف اپنے خاص شاگردوں کے لیے کہتے ہیں۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان یاد رکھنا چاہیے:

''کسی شخص کے گناہ گار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرتا پھرے۔''

6۔ اساتذہ کا دفاع کرنا: شاگردوں اور مستفیدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے علماء کا دفاع کریں اور ان کی طرف منسوب کی جانے والی غلط اور جھوٹی باتوں کی تردید کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی عزت کا دفاع کرے، اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اسے جہنم سے آزاد کر دے۔''

جب ایک عام مسلمان کے دفاع کا یہ اجر ہے تو ان علماء کے دفاع کا اجر کتنا عظیم ہوگا جو انبیاء کے وارث ہیں۔

7۔ اساتذہ کی لغزشوں سے درگزر کرنا: شاگرد کا فرض ہے کہ اگر اس کے شیخ سے کوئی لغزش ہو جائے تو اسے اُچھالنے اور پھیلانے کے بجائے اس سے درگزر کرے۔ اسی لیے کہا گیا ہے: ''علماء کی لغزشیں دفن کر دی جاتی ہیں، بیان نہیں کی جاتیں، اور نہ ہی ان میں ان کی پیروی کی جاتی ہے۔''

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ''علماء کی لغزشوں سے ان کے پیروکاروں کے لیے ہلاکت ہے۔'' پوچھا گیا: کیسے؟ فرمایا: ''عالم کسی مسئلے میں اپنی رائے دیتا ہے، پھر اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مل جاتی ہے تو وہ اپنی رائے چھوڑ دیتا ہے، لیکن اس کے پیروکار پرانی رائے پر قائم رہتے ہیں۔''

سلمان تیمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر تم ہر عالم کی آسان رخصتوں کو جمع کر لو تو تمہارے اندر تمام شر جمع ہو جائے گا۔'' اصمعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر تم کسی شخص کی وفاداری کو جاننا چاہتے ہو تو اس کے اپنے وطن کے لیے شوق، اپنے دوستوں کی یاد اور گزرے ہوئے زمانے پر اس کے غم کو دیکھو۔''

یہ چند باتیں میں نے اپنے شیوخ کے حق میں اپنی کوتاہیوں کے اعتراف، اپنے بھائیوں کو نصیحت اور اپنی امت کے مسائل کے احساس کے طور پر لکھی ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے زندہ اور فوت شدہ شیوخ و علماء کے ساتھ وفاداری نبھانے کی توفیق عطا فرمائے، ہماری گزشتہ کوتاہیوں کو معاف فرمائے، باقی زندگی میں استقامت عطا کرے اور ہمیں حسنِ خاتمہ نصیب فرمائے۔ آمین۔

تہذیبوں کے زوال کے اسباب

مولانا رشید احمد فہیم

اللہ تعالیٰ نے اس دُنیا میں تہذیبوں کے عروج وزوال اور ترقی وتنزل کے چند اٹوٹ قوانین بنائے ہیں جن کو سُنَّۃُ وَ سُنَنُ اللّٰہِ فِی خَلْقِہٖ (اپنی خلقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت/سنتیں) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی کسی سے کوئی رشتے داری نہیں ہے نہ کوئی اس کا مائی باپ ہے اور نہ کوئی اس کی بیوی بیٹا یا بیٹی ہے اس لیے یہ قوانین عروج وزوال اور سنتیں سرِ مُو بدلے بغیر حرکت پذیر ہیں۔ جو کوئی فرد خاندان معاشرہ، قوم یا تہذیب اس کی زد میں آجائے وہ خمیازہ بھگت کر ہی رہتی ہے۔ اسی لیے فرمایا: وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ٥ (یوسف) ''اور مجرموں پر سے تو ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جاسکتا''۔

بلاشبہ تہذیبیں محض پتھر کی عمارتوں، مٹی اور اینٹوں کے شہروں کا نام نہیں ہوتیں، بلکہ حقیقت میں وہ اقدار کے نظام، اخلاقی پیمانوں اور ایک ایسی روح کا نام ہیں جو کسی قوم میں سرایت کر کے اسے منتشر افراد کے مجموعے سے ایک زندہ اور باصلاحیت امت میں تبدیل کر دیتی ہے، جو تعمیر، ترقی اور خدمت کی صلاحیت رکھتی ہو۔

جب یہ روح کمزور پڑ جاتی ہے اور اقدار مرجھانے لگتی ہیں تو ایک ایسا پوشیدہ انتشار شروع ہوتا ہے جو ابتدا میں نظر نہیں آتا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ ایسے زوال پر منتج ہوتا ہے جس کی گونج تاریخ کے صفحات میں سنائی دیتی ہے، جیسا کہ قومِ عاد، ثمود، روم، اندلس اور دیگر عظیم تہذیبوں کے زوال کی داستانیں آج بھی سنائی دیتی ہیں، جو کبھی دنیا میں اپنی قوت اور شان وشوکت کے لیے مشہور تھیں، مگر پھر محض ایک داستان بن کر رہ گئیں۔

مسلم مفکرین نے تہذیبوں کے زوال کے اس سوال پر طویل غور وفکر کیا ہے۔ انہوں نے اس کے اسباب کو سمجھنے اور ان سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کی، کیونکہ جو قوم دوسروں کے زوال کے اسباب کو نہیں سمجھتی، وہ خود بھی انہی المیوں کو نئے انداز میں دُہرا سکتی ہے۔

مفکر مالک بن نبی نے تہذیبوں کے عروج وزوال پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ان کے نزدیک تہذیب کا بنیادی ستون اور دائمی سہارا اقدار اور اخلاق ہیں۔ تہذیب محض مادی ترقی یا عسکری برتری کا نام نہیں، کیونکہ یہ چیزیں وقت کے ساتھ بدل جاتی ہیں اور ان کے توازن بگڑ جاتے ہیں۔ انہوں نے مسلم دنیا کی ان مشکلات کی نشاندہی بھی کی جو آج ہمیں تہذیبی بیداری اور ترقی سے روکے ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق مسئلہ وسائل کی کمی نہیں بلکہ

''قابلِ استعمار ہونا'' ہے۔ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جس نے خاصا بحث ومباحثہ پیدا کیا، مگر اس کے پیچھے ان کی گہری بصیرت پوشیدہ تھی۔ ان کے نزدیک قومیں باہر سے اس وقت تک غلام نہیں بنائی جاسکتیں جب تک وہ اندر سے شکست نہ کھا چکی ہوں۔ استعمار دراصل پہلے سے موجود تہذیبی کمزوریوں، باہمی تفرقے، تعصبات اور انتشار کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مالک بن نبی کے مطابق تہذیب تین عناصر سے بنتی ہے: انسان، زمین، وقت۔۔ لیکن یہ عناصر اس وقت تک حقیقی تہذیب میں تبدیل نہیں ہوتے جب تک انہیں دینی فکر اور عقیدہ یکجا نہ کردے۔ وہ کہتے ہیں:

''تہذیب صرف دینی عقیدے کے ذریعے جنم لیتی ہے، اور اسی وقت زوال پذیر ہوتی ہے جب یہ عقیدہ لوگوں کے دلوں میں اپنی تاثیر کھو دیتا ہے۔''

یہ جملہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ تہذیبوں کا بحران ہمیشہ وسائل یا ذہانت کا بحران نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات معنیٰ اور مقصد کے فقدان کا بحران ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی شناخت اور وابستگی کھو دیتا ہے، صرف اپنی ذات اور خواہشات کے لیے جینے لگتا ہے، تو معاشرے کو جوڑنے والے رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے ابن نبی کا مشہور قول ہے: ''استعمار سے زیادہ خطرناک چیز استعمار کو قبول کرنے کی ذہنیت ہے۔''

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تہذیبوں کا زوال اس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان اپنا راستہ اور اپنی شناخت کھو دیتا ہے، اقدار اور اصولوں سے دور ہو جاتا ہے اور تاریخ کے حاشیے پر جینے والا ایک محض صارف بن کر رہ جاتا ہے۔ جو قوم اپنے خیالات بھی اسی طرح درآمد کرتی ہے جس طرح اپنی اشیائے ضرورت درآمد کرتی ہے، وہ اپنی ذات پر اعتماد کھو دیتی ہے اور تخلیقی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔

مفکرین نے ایک اور خطرے کی نشاندہی کی ہے جسے انہوں نے: ''اشیاء میں افراط اور افکار میں افلاس'' کا نام دیا ہے۔ یعنی ایک قوم جدید ٹیکنالوجی اور مادی وسائل تو حاصل کرسکتی ہے، لیکن اس روح اور فکر سے محروم ہوسکتی ہے جو ان وسائل کو صحیح رخ دے۔ جیسا کہ کہا گیا: ''اصل مسئلہ یہ نہیں کہ ہم چیزیں پیدا کرتے ہیں یا نہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ہم خیالات پیدا کرتے ہیں یا نہیں۔'' یہ جملہ بہت سے جدید معاشروں کی المیہ کیفیت کو بیان کرتا ہے، جہاں ظاہری آسائشیں تو بہت ہیں، مگر تخلیقی روح، فکری استقلال اور اصل شناخت مفقود ہے۔

ایسی تہذیب جو صرف استعمال کرنا جانتی ہو لیکن شعور پیدا نہ کرسکے، ایک ایسے درخت کی مانند ہے جس کے پتے تو گھنے ہوں مگر جڑیں کھوکھلی ہوں۔ ایسا درخت زیادہ دیر آندھیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

مفکرین اور مصلحین نے ہمیشہ تہذیبوں کے عروج وزوال میں اخلاقی اور فکری پہلو کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ ان

کے مطابق اصل بحران اس وقت پیدا ہوتا ہے جب:

''قوت اقدار سے جدا ہو جائے، علم ہدایت سے الگ ہو جائے، اور ترقی کو صرف صنعت اور معیشت تک محدود کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ تہذیب جو مشینیں تو بناتی ہو مگر انسان کو تباہ کر دیتی ہو، اپنے اندر ہی اپنے فنا کے بیج رکھتی ہے۔''

بعض مفکرین نے تہذیب کے عروج و زوال کو تربیتی زاویے سے بھی دیکھا۔ ان کے نزدیک مسلم امت اس وقت کمزور ہوئی جب وہ ایک پیغام بردار اُمت سے بدل کر اپنی داخلی کشمکشوں اور سیاسی خواہشات میں الجھی ہوئی امت بن گئی۔

انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ استبداد تہذیبوں کے زوال کے سب سے خطرناک اسباب میں سے ہے، کیونکہ یہ انسان کی تخلیقی قوت کو ختم کر دیتا ہے اور قوموں کو خوف زدہ ہجوم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے فکری جمود سے بھی خبردار کیا، جو قوموں کو ماضی کے کارناموں پر فخر تو سکھاتا ہے مگر حال اور مستقبل کی تعمیر سے غافل کر دیتا ہے۔

شیخ مصطفیٰ سباعی نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا:

''جو قوم اپنے اخلاق کھو دیتی ہے، وہ اپنی زمین کھونے سے پہلے اپنا وجود کھو دیتی ہے۔''

یہ جملہ تاریخ کے ایک اٹل قانون کی ترجمانی کرتا ہے۔ کتنی ہی ریاستیں ایسی گزری ہیں جن کی سرحدیں تو باقی رہیں، مگر ان کی روح اور شناخت ختم ہو گئی، اور وہ ایک بے جان جسم بن کر رہ گئیں۔ سباعی ہمیشہ قوم کی طاقت کو خاندان، تربیت اور تعلیم کی طاقت سے جوڑتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک تہذیب سیاست کے میدانوں میں نہیں بلکہ سب سے پہلے انسان کے ضمیر میں تشکیل پاتی ہے۔ ان کا ایک خوبصورت قول ہے:

''استعمار کبھی اس قوم کو شکست نہیں دے سکتا جو اخلاق میں مضبوط، ایمان میں مضبوط اور اتحاد میں مضبوط ہو۔''

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تہذیب کی جنگ صرف ہتھیاروں کی جنگ نہیں، بلکہ شعور، اقدار اور سماجی وحدت کی جنگ بھی ہے۔ قومیں عسکری شکست کے بعد دوبارہ اٹھ سکتی ہیں، لیکن اگر وہ اخلاقی اور فکری طور پر شکست کھا جائیں تو ان کا دوبارہ اٹھنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

تمام مصلحین اس بات پر متفق ہیں کہ تہذیبوں کے زوال کا پہلا سبب ظلم ہے۔ جب ظلم عام ہو جاتا ہے تو تہذیب کے زوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل قرآن مجید میں موجود ہے:

وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا

''اور یہ بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ان کے ظلم کے باعث ہلاک کر دیا۔'' (الکہف:59)

ظلم محض ایک سیاسی خرابی نہیں، بلکہ کسی قوم کے اخلاقی ڈھانچے کے بگاڑ کا اعلان ہوتا ہے۔ جب فساد ایک ثقافت

بن جائے، خودغرضی ایک طرزِ زندگی بن جائے اور معاشرتی انصاف مفقود ہوجائے، تو قوم زوال کے سفر پر چل پڑتی ہے، چاہے اس کے پاس دولت اور طاقت کی کتنی ہی فراوانی کیوں نہ ہو۔

تاریخ کا ایک واضح سبق یہ ہے کہ تہذیبیں اچانک نہیں مرتیں بلکہ آہستہ آہستہ دم توڑتی ہیں۔ کہانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب: ضمیر کمزور ہوجاتا ہے، خاندان بکھرنے لگتے ہیں، علم کی قدر ختم ہوجاتی ہے، نااہل لوگ اہلِ صلاحیت پر مقدم کر دیے جاتے ہیں، اور ثقافت محض تفریح اور لغویات کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ اس وقت معاشرہ بظاہر طاقتور دکھائی دیتا ہے، لیکن اندر سے اپنی قوتِ مدافعت کھو چکا ہوتا ہے۔

مؤرخین نے بارہا نشاندہی کی ہے کہ اندلس کا زوال صرف دشمنوں کی طاقت کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ داخلی اختلافات، عیش پرستی اور فکری و سیاسی وحدت کے فقدان نے بھی اس میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ قرآن مجید نے اس ابدی تہذیبی قانون کو ایک مختصر مگر جامع آیت میں بیان کیا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

''بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے۔'' (الرعد: 11)

یہ آیت قوموں کے عروج و زوال کا ایک عالمگیر قانون بیان کرتی ہے۔ تبدیلی کا آغاز انسان سے ہوتا ہے، اس کے فکر سے، اس کے اخلاق سے، اس کے ارادے سے، اور اللہ اور زندگی کے ساتھ اس کے تعلق سے۔ لہٰذا جو قوم اپنا مقام دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہے، اس کے لیے صرف ماضی کی عظمت کا ذکر کافی نہیں۔ اسے ایک نئے انسان کی تعمیر کرنا ہوگی: ایسا انسان جو علم اور ایمان کو جمع کرے، عمل اور اخلاق کو یکجا کرے۔ کیونکہ تہذیب جذباتی خطبوں سے نہیں بنتی، بلکہ طویل تربیت، منظم کردار، وقت کی قدر، علم کی عزت اور عدل کے قیام سے وجود میں آتی ہے۔

خلاصۂ کلام تہذیب لوہے، سیمنٹ اور عمارتوں کے انبار کا نام نہیں، بلکہ ایک قوم کے ضمیر میں موجود بلند اقدار اور عظیم معانی کے اجتماع کا نام ہے۔ جب اصول اور اخلاق ختم ہوجاتے ہیں تو انسان محض ایک صارف بن کر رہ جاتا ہے اور تہذیب اپنی روح کھونے لگتی ہے، چاہے اس کی عمارتیں کتنی ہی بلند کیوں نہ ہوں۔ تاریخ بار بار یہی حقیقت دہراتی ہے: قومیں پہلے اپنے اندر سے گرتی ہیں، پھر دنیا ان کے سقوط کی آواز سنتی ہے۔

عربی نثر وبلاغت کے ائمہ

استاذ محمد علی

اگر ہم انشاء پردازوں کا فیصلہ ان کے خطبات، خطوط، مکالمات اور تصنیفات کی روشنی میں کریں جو ہم تک پہنچی ہیں، اور اسلامی تاریخ کی پہلی صدی سے آغاز کریں، تو سب سے نمایاں شخصیت امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی نظر آتی ہے۔ آپ بلا مبالغہ تمام فصحا و بلغا کے سردار ہیں اور عربی بیان و بلاغت کی بنیاد رکھنے والے ہیں۔ اہلِ علم کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے بعد حضرت علیؓ کا کلام سب سے زیادہ بلیغ ہے۔

اسی طرح بہت سے صحابۂ کرام بھی خطابت اور کتابت کے امام شمار ہوتے ہیں۔ جاہلیت کے زمانے سے ہمیں خطبات اور خطوط کی بہت بڑی مقدار محفوظ نہیں ملتی، کیونکہ عربوں میں باقاعدہ تدوینِ علوم دوسری صدی ہجری کے آغاز میں شروع ہوئی۔ اس سے پہلے عرب اپنی غیر معمولی یادداشت، زبانی روایت اور نسل در نسل نقل ہونے والی روایات پر اعتماد کرتے تھے۔

رقاشی کہتے ہیں: ’’عربوں نے جتنی عمدہ نثر کہی، وہ عمدہ شاعری سے کہیں زیادہ تھی، لیکن نثر کا دسواں حصہ بھی محفوظ نہ رہ سکا، جبکہ شاعری کا دسواں حصہ بھی ضائع نہیں ہوا۔‘‘

مزید یہ کہ عربی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ اب بھی مخطوطات کی صورت میں محفوظ ہے، جو ابھی تک شائع نہیں ہوا، اور اس کا بڑا حصہ یورپ کی جامعات اور کتب خانوں میں موجود ہے۔

پہلی صدی ہجری کا اختتام امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ پر ہوتا ہے۔ ان کے مختصر مگر پر معنی خطوط اور بلیغ خطبات، جنہیں ابن سعد نے ’’الطبقات الکبریٰ‘‘ اور ابن الجوزی نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہیں۔ ان کی تحریروں میں عربی ادب کی شیرینی، شائستگی اور حکمت نمایاں نظر آتی ہے۔ اگرچہ ان کے سیاسی اور انتظامی خطوط وخطبات تعداد میں کم ہیں، لیکن جو شخص ان کا مطالعہ کرے، اس کے اندر اِنشا پردازی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور عربی طرزِ حکومت وانتظام کے بنیادی اصول اس پر واضح ہوجاتے ہیں۔

اس صدی کے دیگر مشہور خطباء میں زیاد بن ابیہ، حجاج بن یوسف ثقفی، قطری بن الفجاءۃ اور عمران بن حطان شامل

ہیں۔ آخری دو خارجیوں کے ممتاز خطبا تھے۔ خارجیوں کی تاریخ اور ان کی خطابت کی جھلک مبرد کی کتاب ''الکامل'' میں تفصیل سے محفوظ ہے، جو اسلامی دنیا میں انقلابی اور باغی خطابت کی ایک نمایاں مثال ہے۔

دوسری صدی ہجری کے ادباء:

دوسری صدی ہجری میں عبدالحمید بن یحییٰ الکاتب نمودار ہوئے، جو فصاحت و بلاغت کی انتہا سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے عربی نثر نگاری اور مکتوب نویسی کے اصول متعین کیے۔ اس کے بعد عبداللہ بن المقفع کا نام آتا ہے، جن کے لیے نثر گویا پوری طرح رام ہوگئی تھی۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ ''الیتیمۃ'' اور ان کے دیگر رسائل نیز ''کلیلہ ودمنہ'' کا ان کا ترجمہ عربی نثر کے اعلیٰ ترین نمونوں میں شمار ہوتا ہے۔ اگر ابن المقفع صرف چھتیس برس کی عمر میں وفات نہ پاتے تو وہ عربی ادب کے طلبہ کے لیے ایسے شاہکار چھوڑ جاتے جو صدیوں تک ان کے لیے مشعلِ راہ بنتے۔ اسی صدی میں سہل بن ہارون بھی پیدا ہوئے۔ اگرچہ ان کی تحریروں کا بہت کم حصہ ہم تک پہنچا ہے، لیکن جو کچھ محفوظ ہے وہ ان کے علم و ادب کی غیر معمولی عظمت کا ثبوت ہے۔ جاحظ ان کی بے حد تعریف کرتے تھے اور اپنی کتابوں میں ان کے اقوال نقل کیا کرتے تھے۔ ان کی نثر ''سہلِ ممتنع'' کی مثال تھی؛ نہ اس میں اجنبیت اور دشوار الفاظ تھے اور نہ بازاری پن۔ جاحظ کے بقول ان لوگوں نے ایسے الفاظ اختیار کیے جو نہ تو وحشی اور پیچیدہ تھے اور نہ ہی عامیانہ اور سطحی۔

اس دوسری صدی کے مشہور خطبا میں داؤد بن علی اور شبیب بن شیبہ بھی شامل تھے، جبکہ نامور کاتبوں میں اسماعیل بن صبیح (ہارون الرشید کے کاتب)، عمر بن مطرف (منصور، مہدی، ہادی اور ہارون الرشید کے کاتب)، اور صالح بن جناح شامل ہیں، جو الأدب والمروءۃ کے مصنف تھے۔ ان کا کلام نہایت لطیف، بامعنیٰ اور حکمت سے بھرپور تھا۔ اس دور میں کہا جاتا تھا کہ لوگوں کے بڑے بلغاء یہ ہیں:

عبداللہ بن المقفع، عمارہ بن حمزہ، خالد بن یزید، حجر بن محمد، انس بن ابی شیخ، سالم بن عبداللہ، مسعدہ، ہزبر، عبد الجبار بن عدی، احمد بن عدی اور احمد بن یوسف۔

صاحبِ ''الفہرست'' نے بھی کئی دیگر نامور ادباء کا ذکر کیا ہے، جن میں ابراہیم بن العباس الصولی، حسن بن وہب اور سعید بن عبدالملک شامل ہیں۔ افسوس کہ ان عظیم اہلِ قلم کی بیشتر تحریریں زمانے کی گردش میں ضائع ہوگئیں، اور صرف ابن المقفع، احمد بن یوسف اور صولی کی کچھ تصانیف ہی ہمارے پاس محفوظ رہ سکیں۔ باقی لوگوں کی تحریروں کے صرف چند منتشر اقتباسات ملتے ہیں جن کی بنیاد پر مکمل رائے قائم کرنا مشکل ہے۔

اسی صدی کے ممتاز مصنفین میں ابواسحاق الکاتب، ابراہیم بن محمد المدبر بھی تھے، جو خلیفہ معتمد علی اللہ کے وزیر تھے اور 279 ہجری میں وفات پائی۔ ان کی نظم ونثر دونوں نہایت اعلیٰ درجے کی تھیں۔ انہوں نے **الرسالة العذراء في موازين البلاغة وأدوات الكتابة** جیسی اہم کتاب بھی تصنیف کی۔

تیسری صدی ہجری کے اُدباء:

تیسری صدی ہجری کی سب سے نمایاں خصوصیت امام جاحظ (متوفی 255ھ) کا ظہور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر فن میں کمال عطا کیا تھا۔ وہ اپنے خیالات، حاضر جوابی، علمی وسعت اور اظہارِ بیان میں یکتا تھے۔ ان سے پہلے مختلف موضوعات کو اس دلکش انداز میں پیش کرنے کا رواج نہیں تھا جس انداز سے جاحظ نے پیش کیا۔ ان کے ہاں نہ تکلف ہے، نہ تصنع، نہ زبردستی کی صنعت گری۔ ان کی عبارت جتنی بار پڑھی جائے، اتنی ہی زیادہ دلنشیں محسوس ہوتی ہے، اور ہر بار اس کے معانی کی نزاکت اور اسلوب کی مضبوطی مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے انسان حیران رہ جاتا ہے کہ انہیں زبان پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ وہ الفاظ کو ان کے مناسب ترین مقام پر استعمال کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ عوامی یا بول چال کے الفاظ بھی استعمال کر لیتے تھے تاکہ خیالات کو ان کی اصل صورت میں منتقل کر سکیں۔ ان کی سب سے عجیب خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی قوتِ استدلال سے باطل کو حق اور حق کو باطل بنا کر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ایک رائے بیان کرتے، دلائل سے قاری کو پوری طرح قائل کر دیتے، پھر اسی مسئلے کا الٹ مؤقف اختیار کرتے اور اس کے حق میں ایسی گفتگو کرتے کہ پہلے مؤقف کی تاثیر کمزور پڑ جاتی۔ گویا وہ ذہنوں کے ساتھ ایک جادوگر کی طرح کھیلتے تھے، لیکن یہ ایک جائز اور علمی جادو تھا۔ جاحظ کی جو بھی کتاب اٹھالی جائے، انسان ان کے تنوع، تخلیقی قوت اور علمی وسعت پر حیران رہ جاتا ہے۔ معانی ان کے سامنے گویا سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں اور الفاظ پوری چابک دستی کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ مطالعہ کرنے والے کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے وہ کبھی کبھی ظرافت، لطائف اور دلچسپ حکایات بھی شامل کر دیتے تھے۔ یہ اسلوب ان کی مشہور کتابوں: **كتاب الحيوان، البيان والتبيين، البخلاء، المحاسن والأضداد، الحاسد والمحسود** اور دیگر رسائل میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے مطبوعہ رسائل کی تعداد بیس سے زیادہ ہے، اور ان کتابوں کا ہر صفحہ بعض اوقات ایک مکمل ضخیم جلد سے زیادہ علمی فائدہ رکھتا ہے۔

ابوحنیفہ دینوری: جاحظ کے بعد ابوحنیفہ دینوری کا نام آتا ہے، جو **الأخبار الطوال** کے مصنف ہیں۔ مصنف کے نزدیک دینوری کی تحریروں میں ندرت اور انفرادیت زیادہ ہے، جبکہ جاحظ کی تحریروں میں زیادہ شیرینی

اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ جاحظ کے معانی دل میں اتر جاتے ہیں اور کانوں کو بھلے لگتے ہیں، جبکہ دینوری کی زبان زیادہ فصیح، زیادہ خالص عربی اور قدیم عربی اسالیب سے زیادہ قریب ہے۔ ابوحیان توحیدی نے ان دونوں کے بارے میں لکھا:

''میرا عقیدہ یہ ہے کہ متقدمین ومتاخرین میں صرف تین شخصیات ایسی ہیں کہ اگر جن وانس سب مل کر ان کی مدح وستائش کریں، ان کے اخلاق، علم، تصنیفات اور فضائل بیان کریں، تب بھی ان کے حقیقی مقام تک نہیں پہنچ سکتے۔''

پھر انہوں نے ان تین شخصیات کے نام لیے: جاحظ، ابوحنیفہ دینوری، ابوزید احمد بن سہل البلخی اور ان میں سے ہر ایک کی غیر معمولی تعریف کی۔

تیسری صدی کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ یونانی، سریانی، فارسی اور ہندی علوم کے تراجم کا سلسلہ عروج پر پہنچ گیا۔ اس تحریک کا آغاز اگرچہ پہلی صدی ہجری کے وسط میں دمشق میں خالد بن یزید اموی کے زمانے میں ہو چکا تھا، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی اس کی سرپرستی کی تھی، لیکن عباسی خلیفہ منصور کے دور میں اس میں بڑی وسعت پیدا ہوئی، اور مامون الرشید کے زمانے میں یہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ ان تراجم نے عربی زبان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ فلسفہ، طب، ریاضی، نجوم اور دیگر علوم کے بے شمار تصورات عربی میں منتقل ہوئے۔ نتیجتاً عربی صرف شعر وحکمت کی زبان نہ رہی بلکہ علم، فلسفہ، تحقیق اور صنعت کی زبان بھی بن گئی۔ مصنف کے نزدیک مامون کا زمانہ درحقیقت عربی ادب، سائنس، علم اور تہذیب کا سنہری دور تھا۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ احمد بن یوسف الکاتب اپنے زمانے کے ممتاز ترین بلغاء میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے بعض خطوط اور رسائل ابوبکر صولی نے اپنی مخطوطہ کتاب الأوراق میں نقل کیے ہیں، جبکہ ابن طیفور نے **کتاب بغداد** میں ان کی تحریروں کے نمونے محفوظ کیے ہیں۔ کتبِ تراجم میں ان کی مسجع نثر (قافیہ دار نثر) کے کئی نمونے ملتے ہیں، جو پہلی صدی ہجری کے فصحاء کے کلام کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کی علمی وادبی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خلیفہ مامون ان کی عقل ودانش اور ادبی صلاحیتوں سے اس قدر متاثر تھا کہ انہیں وزارت اور کتابت کے اہم مناصب سونپے۔

اس دور میں اچھے کاتبوں اور ادیبوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان میں عمرو بن مسعدہ بھی شامل تھے، جو مامون کے وزیر تھے۔ وہ نہایت بلیغ، جامع اور پرمغز اسلوب رکھتے تھے۔ ان کی تحریریں مختصر مگر معنی خیز ہوتیں اور اپنے مقصد کو پوری وضاحت سے ادا کرتیں۔ ان پر ہارون الرشید کا یہ قول پوری طرح صادق آتا ہے:

''بلاغت یہ ہے کہ انسان غیر ضروری طوالت سے دور رہے، مقصد کے معنی کے قریب پہنچے، اور تھوڑے الفاظ میں

زیادہ مفہوم ادا کردے۔''

اسی زمانے کے دوسرے ممتاز ادباء میں ابوعلی دامغانی اور ابوالفتح بستی شامل ہیں، جو اپنی دلکش صنعتِ تجنیس اور بدیع اسلوب کے لیے مشہور تھے۔

ابن قتیبہ اوران کا مقام: اس دور کے جن مصنفین کی کتابیں سب سے زیادہ پھیلی اور مقبول ہوئیں، ان میں ابن قتیبہ (متوفی 276ھ) کا نام سرفہرست ہے۔علم، ادبی ذوق اور حسنِ انشا کے اعتبار سے وہ جاحظ کے بعد دوسرے نمبر پر شمار ہوتے ہیں۔ان کی کتابیں: **الإمامة والسياسة، مختلف تأويل الحديث، الأشربة، المعارف، عيون الأخبار، أدب الكاتب**، ان کی بلند علمی روح، وسیع مطالعے اور ادبی مہارت کا واضح ثبوت ہیں۔ان کے ہاں علم اور ادب ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح چلتے ہیں کہ دونوں میں کوئی جدائی محسوس نہیں ہوتی۔

چوتھی صدی ہجری کے ادباء:

چوتھی صدی ہجری کے ممتاز ترین مصنفین میں احمد بن یوسف المعروف ابن الدایہ (متوفی 340ھ) شامل ہیں۔ ان کا خاندان اصل میں بغداد کا تھا، لیکن ان کے والد مصر منتقل ہو گئے تھے۔ابن الدایہ طُولونی حکومت کے کاتبوں میں شامل تھے۔آج ان کی شہرت زیادہ تر ان کی کتاب **المكافأة** اور **حسن العقبى** کے ذریعے باقی ہے۔ان کتابوں میں حکایات، نصیحتیں، اخلاقی سبق اور حکمت بھری داستانیں جمع ہیں، اوران کا اسلوب فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ ہے۔

اسی دور کے دیگر اہم ادباء میں: ابوبکر صولی (335ھ) مصنف **الأوراق** اور **أدب الكتاب** احمد بن عبد ربہ (328ھ) مصنف **العقد الفريد** جعفر بن قدامہ بن زیاد الکاتب (319ھ) شامل ہیں۔

ابن العمید اور سجع کا فروغ: اس صدی میں ابوالفضل ابن العمید (360ھ) کا مقام بہت بلند ہے۔وہ بنو بویہ کے وزیر تھے، جبکہ ان کے والد سامانی سلطنت کے نامور کاتبوں میں شمار ہوتے تھے۔ابن العمید کو عربی نثر میں سجع اور صنعتِ بدیع کے فروغ کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ان کے متعلق مشہور تھا: ''رسائل نویسی کا آغاز عبدالحمید الکاتب سے ہوا اور اس کا اختتام ابن العمید پر ہوا۔''

جس طرح کہا جاتا ہے کہ: شاعری کا آغاز ایک بادشاہ (امرؤ القیس) سے ہوا اور اس کا اختتام ایک بادشاہ (ابو فراس حمدانی) پر ہوا۔اسی طرح نثر میں ابن العمید کو ایک اختتامی کمال کا درجہ دیا جاتا تھا۔

صاحب بن عباد ابن العمید کے ہم عصر صاحب بن عباد (387ھ) بھی تھے۔ وہ بھی صنعتِ تجنیس، سجع اور لفظی

حسن کے دلدادہ تھے۔ان کا ایک مشہور قول ہے: ''اس زمانے کے بڑے کاتب چار ہیں: پہلا: استادِ رئیس (ابن العمید) دوسرا: استاد ابوالقاسم (عبدالعزیز بن یوسف) تیسرا: ابواسحاق (صابی) اور اگر میں چاہوں تو چوتھے کا نام بھی لے سکتا ہوں۔'' اس آخری اشارے سے وہ خود اپنی ذات مراد لیتے تھے۔

ابوبکر خوارزمی: اسی طبقے میں ابوبکر خوارزمی (383ھ) بھی آتے ہیں۔ان کا اندازِ تحریر ابن العمید سے بہت متاثر تھا۔ان کے مشہور مطبوعہ رسائل فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔اگرچہ ان میں سجع کی کثرت ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا اسلوب دلنشیں اور مؤثر ہے۔شاید ہی کوئی سطر ایسی ہو جو سجع سے خالی ہو۔

بدیع الزمان همدانی: بدیع الزمان ہمدانی (398ھ) اپنی مشہور مقامات اور رسائل کی وجہ سے عربی ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔خوارزمی کے برخلاف ان کا رجحان زیادہ تر فطری اور بے ساختہ نثر کی طرف تھا۔وہ سجع اور بدیعی صنعتوں کا استعمال کرتے تھے، لیکن صرف مناسب مقامات پر۔جب وہ مصنوعی آرائش سے الگ ہو کر اپنے فطری انداز میں لکھتے ہیں تو ان کا کلام براہِ راست دل پر اثر کرتا ہے اور قاری کے جذبات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

ابو اسحاق صابی: ابواسحاق صابی (384ھ) کے خطوط اور سرکاری مراسلات، جو خلفاء اور دیگر حکمرانوں کی جانب سے جاری ہوتے تھے، عربی نثر کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔ان کے بعض رسائل مستقل طور پر شائع ہوئے، جبکہ بہت سا مواد بعد میں **صبح الأعشی** جیسی کتابوں میں محفوظ ہو گیا۔ان کی تحریریں نہایت خوبصورت اور دلکش سجع سے مزین ہیں۔البتہ بعض سرکاری فرامین اور عہد ناموں میں وہ اس تکلف کو ترک بھی کر دیتے تھے۔مصنف کا خیال ہے کہ اگر ابواسحاق صابی سجع کی پابندی کو کچھ کم کر دیتے اور اپنی فطری نثر کو زیادہ آزادی دیتے تو ان کی تحریریں قدیم اہلِ قلم کا سب سے بڑا فخر اور آنے والی نسلوں کے لیے سب سے عظیم ادبی نمونہ ثابت ہوتیں۔

اس مقام پر مصنف نے پہلی سے چوتھی صدی ہجری تک کے عربی نثر نگاروں، خطباء اور کاتبوں کا ایک اجمالی مگر نہایت بصیرت افروز جائزہ مکمل کیا ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ عربی نثر کس طرح حضرت علیؓ کے عہد سے جاحظ، ابن قتیبہ، ابن العمید اور بدیع الزمان ہمدانی تک مسلسل ارتقا پذیر رہی اور ہر دور میں نئے اسالیب اور نئے ادبی کمالات پیدا ہوتے رہے۔

سافٹ وئیر کی ماہیت وحقیقت

دوسری وآخری قسط

جناب مبشر رحمانی

سافٹ وئیر کی ماہیت وحقیقت سمجھنے کے لیے پانچ مثالیں:

قارئین کی خدمت میں پانچ مثالیں پیش کی جاتی ہیں جس سے ان شاء اللہ سافٹ وئیر کی ماہیت وحقیقت مزید واضح ہونے کی امید ہے۔

پہلی مثال: ایک شخص نے کسی سرجن سے پتھری نکالنے کے لیے رابطہ کیا۔ اگرچہ یہ سرجن آلات استعمال کرکے پتھری نکالے گا مگر اصل میں اس سرجن نے پتھری نکالنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کیا۔ اس پتھری نکالنے کی سرجری میں آلات خام مال نہیں کہلائیں گے حالانکہ اس سرجن نے ٹانکے بھی لگائے ہیں، مگر یہ سب آلات ہیں۔

دوسری مثال: ایک سرجن سے ہم آنکھ کی سرجری کرواتے ہیں اور وہ لینس لگاتا ہے اور لینس سمیت اپنی فیس بتاتا ہے تو یہ سرجن اپنی مہارت بھی استعمال کر رہا ہے اور لینس بھی لگا رہا ہے۔ لہٰذا یہ سرجن دو کام کر رہا ہے، ایک اپنی مہارت کا استعمال کرنا اور دوسرا لینس لگانا۔

تیسری مثال: پہلے زمانے میں شادی کارڈ بنوانے کے لیے لوگ دکانوں میں جاتے تھے وہاں پر ٹائپ رائٹر پر ایک شخص موجود ہوتا تھا تو ہم اس کو یہ کہتے تھے کہ شادی کارڈ کا مضمون لکھ کر دے دو تو وہ شخص اپنی ذہنی صلاحیت استعمال کرکے شادی کارڈ کا مضمون لکھ کر دیتا اور پھر اس شادی کارڈ کی کاپیاں بنا کر بیچ دیتے۔ یہاں پر یہ شخص اپنی صلاحیت سے وہ مضمون ٹائپ کرتا تھا اور ایک پرچہ ہمیں دیتا تھا۔

چوتھی مثال: ایک وکیل کو ہم اپنے کیس کے لیے لیتے ہیں کہ ہمیں خلع لینی ہے، وہ خلع کی ساری کاروائی کرتا ہے اور پھر ہمیں خلع کا کاغذ دے دیتا ہے کہ خلع ہوگئی۔ وہ وکیل کیس جیتنے پر اپنی ساری ذہنی صلاحیت استعمال کرتا ہے۔ اس میں جو جو چیزیں مثلاً کاغذ، اسٹیمپ پیپر وغیرہ استعمال ہوتا ہے وہ خلع کا خام مال نہیں کہلائے گا، بلکہ وہ سارے آلات کہلائیں گے۔

پانچویں مثال: ایک نقشہ نویس (آرکیٹیکٹ یا سول انجینئر) کے پاس آدمی جاتا ہے ایک پلازہ بنانے کے لیے کہ

مجھے ایک جیسے بیس فلیٹ کے نقشے بنا دو،تو وہ ایک فلیٹ کا نقشہ بنا کر دیتا ہے، پھر اسی نقشے کو دیکھتے ہوئے ایک فلیٹ بنتا ہے، پھر دوسرا، پھر تیسرا، سب میں اُسی طرح کا ڈرائنگ روم، اُسی طرح کے واش روم، اُسی طرح کے ڈائننگ روم، اُسی طرح کے کچن، سب میں ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ایک ہی جگہ ہوتے ہیں کہ اس طرف فلاں طریقے سے بنانا ہے، اتنے انچ کا بنانا ہے۔تو وہ نقشہ نویس (آرکیٹیکٹ) ایک پرچے پر ساری ہدایات (نقشہ سمیت) بنا کر دے دیتا ہے۔اب یہ نقشہ نویس (آرکیٹیکٹ) کی ذہنی مہارت کی ایک صورت ہوتی ہے جس کو وہ پرچے پر بنا کر دے دیتا ہے۔تو یہ پرانے زمانے کا سافٹ وئیر کہلایا جا سکتا ہے۔یعنی اگر اسی نقشے کو سافٹ وئیر کی شکل میں مانگیں تو بھی وہ بیس فلیٹوں کا نقشہ سافٹ وئیر کی شکل میں دے دے گا اور پہلی صورت میں کاغذ کی شکل میں اس نقشہ کو پرنٹ کر دیا گیا تھا، باقی نقشے وہ پرنٹ کر کے،فوٹو اسٹیٹ کر کے بنا لیتے ہیں کہ اس طریقے کے ہر فلیٹ بنانے ہیں۔پھر ہر فلیٹ والے کو وہ نقشہ تعمیر کرنے کے لیے دے دیا جاتا ہے۔پھر وہ اگر جس ٹھیکے دار سے وہ فلیٹ تعمیر کروائے گا، اگر سامان سمیت کروائے گا تو اس کو ٹھیکیدار کی صلاحیت اور خام مال کی سامان کی لاگت دینی ہوگی اور نقشہ نویس (آرکیٹیکٹ) کو اس کی ذہنی صلاحیت یعنی نقشہ بنانے کی فیس دینی ہوگی۔یعنی نقشہ نویس (آرکیٹیکٹ) کاغذ کے پرزے پر نقشہ بنا کر دے رہا ہے اور ٹھیکیدار نقشے کے مطابق فلیٹ بنا کر دے رہا ہے۔

اب ان پانچوں مثالوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم غور کرتے ہیں تو سافٹ وئیر بنانے کا آڈر کسی سافٹ وئیر کمپنی کو مل رہا ہے تو اس سافٹ وئیر کمپنی میں کئی سافٹ وئیر پروگرامرز موجود ہیں جو کہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے سافٹ وئیر کا کوڈ تحریر کر رہے ہیں (پہلی مثال، تیسری مثال، چوتھی مثال، پانچویں مثال)۔پھر اگر وہ اس سافٹ وئیر کے ساتھ کوئی ہارڈ وئیر (آلہ یا کمپیوٹر وغیرہ) بھی ہمیں دیتے ہیں جس پر وہ سافٹ وئیر چلے گا تو یہ دوسری مثال کی طرح ہے۔خلاصہ کلام یہ کہ سافٹ وئیر بنانے میں جو بجلی خرچ ہو رہی ہے، جس گاڑی پر بیٹھ کر کمپیوٹر پروگرامر آ رہا ہے، جس کمپیوٹر کو وہ استعمال کر رہا ہے، جس دفتر میں وہ یہ کام کر رہا ہے، یہ سب آلات ہیں اور اصل میں کمپیوٹر پروگرامر اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے کمپیوٹر سافٹ وئیر تحریر کر رہا ہے جو کہ ایک صلاحیت ہے۔

سافٹ وئیر کی خرید وفروخت کی دو صورتیں:

جب سافٹ وئیر کسی کو فروخت کیا جاتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہو سکتیں ہیں۔ایک صورت یہ کہ کوئی شخص کسی کو اپنی ویب سائٹ یا سافٹ وئیر دے تو صرف اس کی کاپی دے، جو بنیادی حقوق ہیں وہ اصل مالک کے پاس رہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ کلائنٹس کو وہ ویب سائٹ یا سافٹ وئیر اس طریقے سے دے دے کہ اصل مالک اس سے

بالکل بے دخل ہوجائے اور کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ دونوں صورتیں ممکن ہیں اور رائج بھی ہیں اور ان دونوں ہی صورتوں میں مزید کئی ذیلی صورتیں بھی ممکن ہیں، جن کا یہاں پر تذکرہ نہیں کیا جارہا۔ بعض سافٹ ویئر ایسے ہوتے ہیں کہ جب صارف ان کو مالک سے خریدتا ہے تو مالک بالکل بے دخل ہوجاتا ہے اور اس مالک کا اس سافٹ ویئر سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ مثلاً ایک سافٹ ویئر انجینئر یا کوئی کمپنی ایک مخصوص صارف کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک سافٹ ویئر تیار کرے اور پورے حقوق اس صارف کے دے دے۔ اب یہ صارف کی مرضی ہے کہ وہ جو چاہے اس سافٹ ویئر میں تصرف کرے اور اصل مالک بالکل بے دخل ہوجائے گا۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ مثلاً دارالعلوم کراچی ایک سافٹ ویئر کمپنی سے ایک تصنیف و تالیف کا سافٹ ویئر بنوائے اور پھر معاہدہ کر کے اس کمپنی سے اس کے مکمل حقوق وقبضہ حاصل کرلے۔ اب دارالعلوم کراچی اس سافٹ ویئر کی مکمل مالک ہوگی۔ اگر اس سافٹ ویئر میں کوئی خامی آتی ہے تو وہ دارالعلوم کراچی کی ہی ذمہ داری ہوگی۔ اور اگر دارالعلوم کراچی چاہے تو اس کے سیکڑوں کاپیاں بنا کر دیگر مدارس میں تقسیم کردے۔

اگر ہم عالمی سافٹ ویئر مارکیٹ کا تجزیہ کریں اور سافٹ ویئر کی بڑی کمپنیوں کا سافٹ ویئر کی خرید وفروخت کا جائزہ لیں تو بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سافٹ ویئر بنانے والی عالمی کمپنیوں کی اکثریت سافٹ ویئر کے ملکیتی حقوق اپنے پاس ہی رکھتی ہیں اور صرف صارفین کو سافٹ ویئر کا لائسنس (سافٹ ویئر استعمال کرنے کا حق) فروخت کرتی ہے۔ مثلاً دنیا کی سب سے بڑی سافٹ ویئر کمپنیوں میں مائیکروسافٹ، گوگل، اوریکل، اور آئی بی ایم وغیرہ صارفین کو جب سافٹ ویئر فروخت کرتی ہیں تو یہ کمپنیاں صارفین کو صرف سافٹ ویئر کی کاپیاں اور لائسنس فروخت کرتی ہیں اور سافٹ ویئر کے بنیادی حقوق اپنے پاس ہی رکھتی ہیں۔ دنیا میں جو بڑی سافٹ ویئر کمپنیاں ہیں، ان میں سے کچھ کا ریونیو بلین امریکی ڈالر سے بھی تجاوز کرتا ہے اور یہ کمپنیاں کچھ سافٹ ویئر کی بنیاد پر اپنے پورے کاروبار کو کھڑا کیے ہوئے ہیں اور یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے بنائے گئے سافٹ ویئر کے اصل حقوق اپنے پاس ہی رکھتیں ہیں اور صرف سافٹ ویئر کا لائسنس جاری کرتی ہیں۔ اسی طریقے سے اگر پاکستان میں کوئی سافٹ ویئر بنانے والی کمپنی سافٹ ویئر فروخت عالمی مارکیٹ میں کرے گی تو اس سافٹ ویئر بنانے والی کمپنی کو بھی سافٹ ویئر کے عالمی لائسنس قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے خرید وفروخت کرنی ہوتی ہے۔

پاکستان میں بعض لوگ شاید یہ سمجھتے ہوں کہ سافٹ ویئر ہاؤس سافٹ ویئر بنا دیتے ہیں اور پھر مارکیٹ میں ان سافٹ ویئر کی خرید وفروخت شروع ہوجاتی ہے، اور لوگ اس سافٹ ویئر کو آگے بھی فروخت کردیتے ہیں جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا اور یہ تاثر عالمی مارکیٹ میں سافٹ ویئر کی خرید وفروخت، یعنی عُرف سے لاعلمی کے نتیجے کی وجہ سے پیدا

ہوتا ہے۔اس کو اس مثال سے بھی سمجھیے کہ جب کوئی مشہور سافٹ وئیر مثلاً مائیکروسافٹ آفس خریدتا ہے تو کون اس سافٹ وئیر کے لائسنس ایگریمنٹ (جو کہ تیس چالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے) کو پڑھتا ہے؟ نیز پاکستان میں سی ڈی میں ایک سافٹ وئیر کچھ سو یا ہزار روپے میں پائریٹڈ (نقل شدہ، جعلی، بغیر اجازت کے) بآسانی مل جاتا ہے جبکہ یہی سافٹ وئیر عالمی مارکیٹ میں لائسنس کے ساتھ کئی سو یا کئی ہزار امریکی ڈالر میں ملتا ہے۔اس مثال سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں بعض صورتوں میں (عوامی و نچلی سطح پر) سافٹ وئیر کی خرید وفروخت ایک پاریٹڈ مارکیٹ میں عمل پذیر ہوتی ہے اور شاید اسی وجہ سے عالمی قوانین (عُرف) سے ناواقفیت کی بنا پر کچھ لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ سافٹ وئیر ہم خرید سکتے ہیں، اس میں ردو بدل کر سکتے ہیں اور اسے آگے بھی فروخت کر سکتے ہیں۔اس کے برعکس پاکستان میں ہی کچھ مستند اور بڑے ادارے و کمپنیاں باقاعدہ لائسنس دے کر عالمی سافٹ وئیر مہنگے داموں خریدتے ہیں۔اسی طریقے سے پاکستان کے بڑے سافٹ وئیر ہاؤس جب سافٹ وئیر عالمی مارکیٹ میں اپنے سافٹ وئیر فروخت کرتے ہیں تو وہ عالمی سافٹ وئیر کے لائسنس کے قوانین کے تحت عمومی طور پر ملکیتی حقوق اپنے پاس رکھ کر اس سافٹ وئیر کے لائسنس فروخت کرتے ہیں۔

سافٹ وئیر لائسنس اور سافٹ وئیر کی خرید وفروخت سے مراد کیا ہے؟

مارکیٹ میں سافٹ وئیر کی جب خرید وفروخت ہوتی ہے تو عام لوگ یہ تاثر لیتے ہیں کہ شاید وہ ایک شئی خرید رہے ہیں اور پھر وہ اس کو آگے بھی فروخت کر سکتے ہیں کیونکہ سافٹ وئیر اُن کی ملکیت میں آچکا ہے۔ یہ تاثر لینا غلط ہے۔عمومی طور پر جب کوئی بازار میں جا کر سافٹ وئیر خریدتا ہے یا آن لائن سافٹ وئیر خریدتا ہے تو درحقیقت وہ سافٹ وئیر استعمال کرنے کے اختیار یعنی لائسنس حاصل کرتا ہے اور لائسنس کے اختتام پر وہ اس سافٹ وئیر کو مزید استعمال نہیں کر سکے گا اور نہ ہی وہ دورانِ استعمال (مدتِ لائسنس) اس سافٹ وئیر کو آگے کسی دوسرے کو بیچ سکتا ہے۔آسان الفاظ میں جب کوئی سافٹ وئیر خریدتا ہے تو دراصل وہ سافٹ وئیر استعمال کرنے کے اختیارات حاصل کرتا ہے اور وہ صرف سافٹ وئیر کو استعمال کرے گا لہٰذا جب وہ سافٹ وئیر کا مالک ہی نہیں بنا تو اس کو سافٹ وئیر کو آگے فروخت کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔

سافٹ وئیر کی ماہیت وحقیقت اور اس کی خرید وفروخت کو سمجھنے کے لیے سافٹ وئیر کے لائسنس کے نظام کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔لائسنس کے حساب سے سافٹ وئیر کے کئی اقسام کے لائسنس ہو سکتے ہیں جن میں ”فری اور اوپن لائسنس“ اور ”نان فری“ لائسنس شامل ہیں۔ان لائسنس کی قسم کے حساب سے سافٹ وئیر سے متعلق مختلف معاملات

طے پاتے ہیں جن میں اس سافٹ وئیر کے کاپی رائٹ کی ملکیت، اس سافٹ وئیر کو چلانا، اس کی کاپی کرنا، اس میں تبدیلی کرنا، اس کو تقسیم کرنا، اور اس کا "سب لائسنس" جاری کرنے جیسے حقوق شامل ہوتے ہیں۔

عمومی طور پر جب کوئی سافٹ وئیر خریدتا ہے تو دراصل وہ اس کو استعمال کرنے کا لائسنس حاصل کرتا ہے جسے "اینڈ یوزر لائسنس ایگریمنٹ" یعنی صارف کا لائسنس کا معاہدہ کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل سافٹ وئیر بنانے والے (یا فروخت کرنے والے) اور سافٹ وئیر صارف کے درمیان ایک قانونی معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدے کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ مثلاً ایک کمپنی ایک سانچہ تیار کرتی ہے جو کہ پلاسٹک کی بوتل، کھلونے یا پرزہ جات کو تیار کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس سانچہ کے ڈیزائن کو بنانے والا اس سانچے کا مالک ہے۔ پھر یہ مالک لائسنس جاری کرتا ہے مختلف فیکٹریوں کو جو کہ اس سانچہ کو استعمال کر سکتے ہیں۔ بہت ساری فیکٹریاں ایک ہی وقت میں ایک ہی سانچے کو استعمال کرتے ہوئے ایک ہی جیسی پروڈکٹ (پلاسٹک کی بوتل، کھلونے یا پرزہ جات) تیار کر سکتی ہیں۔ سانچے کے ڈیزائن کو بنانے والا مالک معاہدہ (لائسنس) ان فیکٹریوں سے دو طریقے سے کر سکتا ہے۔ پہلی صورت میں فیکٹریاں اس سانچے کے ڈیزائن کو فروخت، اور سانچے کے ڈیزائن میں ردوبدل کر سکتی ہیں۔ دوسری صورت میں فیکٹریاں اس سانچے کے ڈیزائن کو فروخت نہیں کر سکتیں اور نہ ہی سانچے کے ڈیزائن میں ردوبدل کر سکتیں ہیں۔ فیکٹریوں کے سانچے کی آگے فروخت اور سانچے میں ردوبدل کا انحصار کیے گئے معاہدہ (لائسنس) پر ہوگا۔ اس سانچے کی مثال کو سافٹ وئیر پر اگر محمول کیا جائے تو سانچہ دراصل سافٹ وئیر ہے، جو معاہدہ (لائسنس) کیا گیا وہ "اینڈ یوزر لائسنس ایگریمنٹ" ہے، اور جو پروڈکٹ ہیں وہ سافٹ وئیر کی کاپیاں ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ہم نے یہ مثال صرف سمجھانے کی غرض سے دی ہے جس میں سانچہ ایک حسی فزیکل شئ ہے جبکہ سافٹ وئیر غیر حسی، تخیلاتی، اور ڈیجیٹل شئ ہے۔

دنیا کے سب سے بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں میں سافٹ وئیر بنانے والی کمپنیاں بھی شامل ہیں جن میں سے چند مشہور یہ ہے: مائیکروسافٹ، گوگل (نیا نام: الفابیٹ)، اوریکل، ایس اے پی، ایڈوبی، آئی بی ایم، اور سیلز فورس شامل ہیں۔ یہ دنیا کی امیر ترین سافٹ وئیر بنانے والی ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں اور ان کے بنائے ہوئے سافٹ وئیر کی پوری دنیا محتاج ہے۔ ذیل میں ہم صرف دو مشہور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے سافٹ وئیر کے لائسنس کے اقتباسات نقل کرتے ہیں جن میں پہلی کمپنی گوگل (الفابیٹ) ہے، اور دوسری کمپنی مائیکروسافٹ ہے۔ جبکہ دیگر سافٹ وئیر کمپنیوں کے سافٹ وئیر لائسنس ان سافٹ وئیر کمپنیوں کی ویب سائٹ پر دیکھے جا سکتے ہیں مثلاً اوریکل، ایس اے پی، ایڈوبی، آئی بی ایم، اور سیلز فورس۔

گوگل اپنے سافٹ وئیر کو فروخت کرتے وقت یہ کہتی ہے کہ

"آپ ہماری خدمات یا سافٹ ویئر کے کسی بھی حصے کو کاپی، ترمیم، تقسیم، فروخت یا لیز پر نہیں دے سکتے"۔

مائیکروسافٹ اپنے سافٹ وئیر کو فروخت کرتے وقت یہ کہتی ہے کہ:

"سافٹ ویئر لائسنس یافتہ ہے، فروخت نہیں کیا گیا، اور مائیکروسافٹ، سافٹ ویئر کے تمام حقوق محفوظ رکھتا ہے جو ان شرائط کے تحت مائیکروسافٹ کی طرف سے واضح طور پر نہیں دیے گئے ہیں۔ یہ لائسنس آپ کو کوئی حق نہیں دیتا، اور آپ غیر قانونی طور پر ایسا نہیں کر سکتے ہیں: سافٹ ویئر یا سروسز کو شائع، کاپی، کرایہ، لیز، فروخت، برآمد، درآمد، تقسیم یا قرضہ دینا، جب تک کہ مائیکروسافٹ آپ کو واضح طور پر ایسا کرنے کی اجازت نہ دے؛"

ڈیجیٹل اشیاء سے متعلق چند گزارشات:

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ: "بعض ویب سائٹس یا سافٹ وئیر ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے میں فروخت ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت عرفاً ایک قابلِ قدر ڈیجیٹل پراپرٹی کی ہوتی ہے، جسے مال کے طور پر استعمال، منتقل اور بیچا جاتا ہے"۔

مذکورہ بالا بات ایسی نہیں جیسا کہ پیش کی گئی اور اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے "ڈیجیٹل وجود" کی حقیقت کو سمجھنا ہوگا۔ اس حقیقت کو سمجھنا اس لیے بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ مُرَوَّجہ عالمی معاشی نظام میں ان "ڈیجیٹل اشیاء یا اثاثوں" کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے اور انہیں کی بنیاد پر فرضی وتخیلاتی معیشت کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ نیز بعض لوگ ان میں سے کچھ ڈیجیٹل اشیاء کو قابلِ قدر اثاثے کو طور پر پیش کرتے ہیں اور اس کے متعلق پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ مال ہیں، انہیں استعمال، منتقل اور بیچا جا سکتا ہے حالانکہ نہ وہ ڈیجیٹل اشیاء قابلِ قدر ہوتی ہیں، نہ ہی سنجیدہ معاشی ماہرین انہیں "ڈیجیٹل اثاثہ" سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان سے کوئی استفادہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بس لوگ انہیں خرید وفروخت کر کے جُوئے اور سٹے بازی کا بازار گرم کرتے ہیں۔

ہم ڈیجیٹل اشیاء کو دو طرح سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول وہ ڈیجیٹل اشیاء جن کا ڈیجیٹل وجود ہوتا ہے۔ ان میں مختلف اقسام کے کمپیوٹر سافٹ وئیر ہیں، یہ اپنا ڈیجیٹل وجود رکھتے ہیں، ان سافٹ وئیرز کی اپنی قدر ہوتی ہے، ان کا استعمال کیا جاتا ہے، ان سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے، اور ان کی خرید وفروخت بھی کی جاتی ہے۔ مثلاً ایڈوبی سافٹ وئیر کو گرافک ڈیزائنگ میں استعمال کیا جاتا ہے اور اوریکل سافٹ وئیر کے ذریعے سے ریکارڈ کو محفوظ کیا جاتا ہے، واٹس اپ کے سافٹ وئیر کو کال کرنے، میسج کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

دوسری قسم ان ڈیجیٹل اشیاء کی ہے جن کا ڈیجیٹل وجود نہیں ہوتا، ان کی اپنی ذاتی قدر نہیں ہوتی اور ان سے

استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔مثلاً جانوروں جیسے بلی کی ڈیجیٹل آرٹ کی تصاویر، نان فنجیبل ٹوکن (این ایف ٹی)، کرپٹو اثاثے وغیرہ۔

پہلے یہ سمجھتے ہیں کہ "ڈیجیٹل وجود" نہ رکھنے سے کیا مراد ہے۔مثال کے طور پر کاغذ پر ایک شخص کے نام کے سامنے پانچ عدد سیب کی تعداد لکھ دی جائے تو کوئی بھی یہ نہیں کہے گا کہ حقیقی سیب موجود ہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یہ صرف کاغذ پر سیب کی تعداد کا اندراج ہے۔اسی طریقے سے اگر کمپیوٹر پر ایک شخص کے نام کے سامنے پانچ عدد سیب کی تعداد لکھ دی جائے تو کوئی بھی یہ نہیں کہے گا کہ یہ ان سیبوں کا ڈیجیٹل وجود ہے بلکہ صرف یہ کہا جائے گا کہ اب سیبوں کی تعداد کو کاغذ کے بجائے کمپیوٹر پر اندراج کر دیا گیا ہے۔اسی طریقے سے جب ان سیبوں کی خرید وفروخت ہوگی تو ان سیبوں کی منتقلی ہو رہی ہوگی اور ان تمام معاملات کا اندراج کھاتے یعنی کاغذ پر لکھ کر ہو رہا ہوگا یا پھر کمپیوٹر میں ڈیجیٹل شکل میں اندراج کر کے ہو رہا ہوگا۔لہٰذا اس تمام عمل کو سیبوں کی خرید وفروخت کے معاملات کا اندراج تو کہا جا سکتا ہے مگر یہ بذاتِ خود سیب نہیں۔آسان الفاظ میں سیبوں کی خرید وفروخت کے معاملات کا کھاتے میں اندراج کو سیبوں کی حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔

خلاصہ یہ کہ کسی چیز کے اندراج کو اس چیز کی حقیقت نہیں سمجھا جائے گا۔خلاصہ کلام یہ کہ ڈیجیٹل اشیاء کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جن کا ڈیجیٹل وجود نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی اپنی ذاتی قدر ہوتی ہے اور نہ ہی ان سے استفادہ حاصل کیا جا سکتا ہے البتہ ایسے ڈیجیٹل اثاثوں کو غیر حقیقی معیشت کو پروان چڑھانے والے خرید وفروخت کرتے ہیں۔

سائنسی اعتبار سے بعض ڈیجیٹل اشیاء کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے، یہ ایک تصوراتی، تخیلاتی اور فرض کی ہوئی چیز ہوتی ہے جس کا ڈیجیٹل وجود تک نہیں ہوتا ہے۔بعض ڈیجیٹل اشیاء کو پیٹنٹ یعنی انٹیلیکچول پراپرٹی، بجلی، حقوق گڈول، حقوقِ مجردہ، کاپی رائٹ، ٹریڈ مارک، یا برانڈ کی طرح نہیں سمجھا جا سکتا اور جو لوگ بعض ڈیجیٹل اشیاء کو بجلی، حقوق گڈول، حقوقِ مجردہ، کاپی رائٹ، ٹریڈ مارک، یا برانڈ پر قیاس کر رہے ہیں وہ سائنسی طور پر سراسر غلط ہیں۔نیز ایسے بعض ڈیجیٹل اشیاء میں کوئی مال، کوئی قرض، کوئی خدمت، کوئی حق، اور کوئی اثاثہ نہیں ہے جو بیچا جا رہا ہے۔نتیجتاً، بعض ڈیجیٹل اشیاء میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے "مبیع" سمجھا جا سکے۔

اس سلسلے میں حضرت مفتی محمد معاذ اشرف صاحب دامت برکاتہم کا ایک اہم مضمون "این ایف ٹی کا شرعی جائزہ"، ماہنامہ البلاغ اپریل ۲۰۲۳ میں شائع ہو چکا ہے، اس کو ملاحظہ فرمالیں۔نیز راقم کا ایک مضمون "ڈیجیٹل وجود کی حقیقت" ماہنامہ صوت القرآن، نومبر ۲۰۲۴ میں شائع ہو چکا ہے، اس کو بھی ملاحظہ فرمالیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ سافٹ وئیر کی ماہیت وحقیقت اور اس کی خرید وفروخت سے متعلق یہ امور واضح ہوتے ہیں۔

□ کمپیوٹر پروگرامر محنت کرتا ہے، سوچتا ہے، اپنی دماغی صلاحیتیں لگاتا ہے اور پھر وہ کمپیوٹر کو ایسی ہدایات جاری کرتا ہے جس سے کمپیوٹر کوئی فائدہ مند کام انجام دیتا ہے اور اسی فائدہ مند کام کو سافٹ ویئر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

□ سافٹ ویئر کسی خام مال سے وجود میں نہیں آتا کیونکہ سافٹ ویئر کمپیوٹر کو دی گئی ہدایات کا نام ہے اور یہ کمپیوٹر پروگرامر کی دماغی صلاحیتوں کی وجہ سے وجود میں آتا ہے۔

□ پروگرامنگ لینگویج کو سافٹ ویئر کا خام مال نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی سافٹ ویئر مختلف پروگرامنگ لینگویج سے مل کر بنتا ہے۔ پروگرامنگ لینگویج وہ "ہنر" اور "صلاحیت" ہے جس کے ذریعے سے کمپیوٹر پروگرام (سافٹ ویئر) تحریر کیا جاتا ہے اور جس کے ذریعے سے کمپیوٹر کو ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔

□ عالمی دنیا میں سافٹ ویئر کو بطور کاپی رائٹ کے قانونی طور پر تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ نیز جب کوئی بازار سے سافٹ ویئر خریدتا ہے یا آن لائن سافٹ ویئر خریدتا ہے تو درحقیقت وہ سافٹ ویئر استعمال کرنے کے اختیار یعنی لائسنس حاصل کرتا ہے۔

□ اگر ہم عالمی سافٹ ویئر مارکیٹ کا تجزیہ کریں اور سافٹ ویئر کی بڑی کمپنیوں کا سافٹ ویئر کی خرید وفروخت کا جائزہ لیں تو بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سافٹ ویئر بنانے والی عالمی کمپنیوں کی اکثریت سافٹ ویئر کے ملکیتی حقوق اپنے پاس ہی رکھتی ہیں اور صرف صارفین کو سافٹ ویئر کا لائسنس (سافٹ ویئر استعمال کرنے کا حق) فروخت کرتی ہے۔

□ سافٹ ویئر کی ماہیت وحقیقت اور اس کی خرید وفروخت کو سمجھنے کے لیے سافٹ ویئر کے لائسنس کے نظام کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ لائسنس کے حساب سے سافٹ ویئر کے کئی اقسام کے لائسنس ہو سکتے ہیں جن میں "فری اور اوپن لائسنس" اور "نان فری" لائسنس شامل ہیں۔ ان لائسنس کی قسم کے حساب سے سافٹ ویئر سے متعلق مختلف معاملات طے پاتے ہیں جن میں اس سافٹ ویئر کے کاپی رائٹ کی ملکیت، اس سافٹ ویئر کو چلانا، اس کی کاپی کرنا، اس میں تبدیلی کرنا، اس کو تقسیم کرنا، اور اس کا "سب لائسنس" جاری کرنے جیسے حقوق شامل ہوتے ہیں۔

□ عمومی طور پر جب کوئی سافٹ ویئر خریدتا ہے تو دراصل وہ اس سافٹ ویئر کو استعمال کرنے کا لائسنس حاصل کرتا ہے جسے "اینڈ یوزر لائسنس ایگریمنٹ" یعنی صارف کا لائسنس کا معاہدہ کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل سافٹ ویئر بنانے والے (یا فروخت کرنے والے) اور سافٹ ویئر صارف کے درمیان ایک قانونی معاہدہ ہوتا ہے۔

(باقی صفحہ نمبر: ۶۴)

شخصیت

شیخ الحدیث جامعہ دارالعلوم حقانیہ

حضرت مولانا محمد ادریس حقانی رحمۃ اللہ علیہ کی المناک شہادت

تحریر مولانا عرفان الحق حقانی

استاذ حدیث و منتظم اعلیٰ جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک

جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے مایہ ناز شیخ الحدیث، ہشت نگر ترنگزئی کے معروف علمی شخصیت، پٹھانوں کے مقبول عام وخاص مقرر۔ اکابرین کے علمی عظمتوں کے امین، شیخ الحدیث مولانا مفتی شہزادہؒ کے پوتے اور شیخ الحدیث حضرت مولانا حسن جان مدنی شہیدؒ کے فرزند نسبتی حضرت مولانا محمد ادریس حقانیؒ کو دن دیہاڑے صبح پونے آٹھ بجے منگل کے روز ۵ مئی ۲۰۲۶ء کو سفاک قاتلوں نے چلتی گاڑی میں بے دردی سے گولیوں کے پے در پے وار کر کے موضع اتمان زئی میں شہید کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ان کے دو سرکاری محافظ بھی شدید زخمی ہوئے، اس حادثے کی خبر مولانا خبیب حقانی نے احقر کو سوا آٹھ بجے واٹس ایپ کے توسط سے دی۔ دماغ کے شریانوں پر یہ خبر گولی بن کر گری جس کی وجہ سے عقل وفکر نے کام چھوڑ دیا بعد ازاں کلمات ترجیع پڑھ کر خود کو سنبھالا۔ وہم وگمان میں بھی یہ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو جائے گا۔

پونے دو گھنٹہ کی طویل مسافت طے کر کے روزانہ حقانیہ آنا: مولانا محمد ادریس شہید اس وقت وہ حقانیہ میں گزشتہ گیارہ برس سے بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس دینے میں مصروف تھے۔ اپنے مادر علمی میں اپنے مشائخ اساتذہ کے حین حیات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس اعلیٰ مرتبہ سے نوازا۔ تواضع اور خاکساری ان کی طبیعت ثانیہ تھی۔ میں ہمیشہ ملاقات کے موقع پر ان کا شکریہ ادا کرتا کہ وہ روزانہ اپنے گاؤں سے پونے دو گھنٹہ کی مسافت طے کر کے حقانیہ تشریف آوری فرماتے ہیں۔ اس پر وہ مجھے مخاطب کر کے فرماتے کہ مجھے بار بار شکریہ کہہ کر شرمندہ نہ کرو۔ میں اسی حقانیہ کی بدولت سب کچھ ہوں۔ ہمارے اساتذہ کے ہمارے اوپر بڑے احسانات ہیں۔ اسی دارالعلوم حقانیہ کی بدولت ہمیں اللہ تعالیٰ نے عزتوں کے تاج پہنائے ہیں۔

میں ان کے اعتراف حق کو سن کر کہتا کہ ٹھیک ہے حضرت لیکن من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔ جو مخلوق کا شکر ادا نہیں کرتا وہ خالق کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا۔ پھر وہ بعض اوقات مجھے کہتے کہ یہ تمہارا احسان ہے کہ مجھے

حقانیہ میں خدمت کا موقع دیا، مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے ہی مجھے مسجد نبوی ﷺ میں دارالعلوم حقانیہ کی تدریس کے سلسلہ میں آنے کی دعوت دی بعد میں تکوینی امور ایسے بن گئے کہ شیخ الحدیث مولانا شیر علی شاہ قدس سرہٗ کی رحلت پر مولانا سمیع الحق شہیدؒ کے حکم سے مجھے آنا پڑ گیا لیکن اس سے سالہا سال قبل آپ نے مجھ کو یہ دعوت دے رکھی تھی۔ افسوس یہ سب باتیں قصہ پارینہ ہوگئیں۔

تازہ خواہی داشتن داغہائے سینہ را　　　　باز خواں ایں قصہ پارینہ را

تواضع اور عاجزی اختیار کرنے کی دعوت: تواضع کی دعوت ہمیشہ اپنے تلامذہ اور متعلقین ومعتقدین کو بطور خاص دیتے تھے۔فرماتے تھے کہ جو مولوی متکبر ہو اس سے پڑھو بھی مت۔اسلئے کہ اس کی تعلیم کا اثر اس کے اپنی شخصیت پر نہیں ہے تو پھر دوسروں کو کیا عمل کی دعوت دے گا۔ لم تقولون ما لا تفعلون ۔ نیز ایسے پیر سے بھی بیعت نہ کرنا جو کہ بڑائی کرتا ہوں اللہ تعالیٰ ہی کو بڑائی زیبا ہے، اس کی بیعت سے تمہیں کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اسی طرح وہ تبلیغی شخص جو عجب وتکبر کا خوگر ہو اس سے بھی خود کو بچاؤ۔خود کو بڑا سمجھنے والا دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے اور وہ لوگوں کو برا بھلا کہتا ہے۔

راقم الحروف کے ساتھ محبت ودل لگی: موضع شیرین کوٹھا نوشہرہ کے ایک مدرسہ میں امسال شعبان میں سالانہ جلسہ تھا میں نے حاضر ہو کر خطاب کیا اور پھر مہتمم مدرسہ کے ہاں ضیافت میں شرکت کی ۔اس موقع پر شیخ الحدیث مولانا مغفور اللہ باباجی بھی تشریف لائے جنہوں نے مجھے روحانی سلاسل میں بطور خاص اجازتِ خلافت سے نوازا۔ اسی اثناء شیخ الحدیث مولانا محمد ادریسؒ بھی اس جلسہ میں شرکت کی خاطر پہنچ گئے تو اس موضوع پر خبر پا کر بڑی دل لگی فرمائی اور مجھے مخاطب کر کے کہا کہ روحانی اجازت پا کر کچھ دعوت وسخا کا اظہار بھی کیا ہے یا مفت میں اجازت پائی اور پھر حضرت شیخ شہیدؒ نے مولانا مغفور اللہ باباجی کو کہا کہ مولانا عرفان الحق عظیم شخصیت مولانا عبدالحقؒ کے پوتے ہیں ہمارے تو سروں کے تاج ہیں۔

مستقل مدرسہ قائم کرنے کے بجائے حقانیہ کی خدمت کو ترجیح دینا:

شیخ شہیدؒ کو اللہ تعالیٰ نے قبولیت اور شہرت کے اعلیٰ مناصب پر فائز فرمایا تھا اس حد تک کہ اگر آپ چاہتے تو علیحدہ مدرسہ چند دنوں میں قائم کر سکتے تھے، صاحب ثروت ومتمول لوگ آپ کے ایک اشارے پر یہ وسائل مہیا کر لیتے لیکن آپ نے حقانیہ اور نعمانیہ میں تدریس ہی غنیمت سمجھی اور دوسرے معنوں میں اپنی علیحدہ ریاست قائم کرنے سے گریز کرتے رہے۔ یہ مادر علمی حقانیہ کے ساتھ آپ کی وفاداری کا بیّن ثبوت ہے۔جس طرح ان کے

پیشرؤوں شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہؒ اور شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد فرید زروبوی قدس سرہٗ نے اپنا علیحدہ مدرسہ قائم کرنے کے بجائے تادم رحلت دارالعلوم حقانیہ کی خدمت کو ترجیح دی اسی طرح آپ نے بھی یہی سبق اکابر سے پایا ورنہ آج ترنگزئی میں ایک مدرسہ آپ کی نسبت سے قائم ہوتا۔

میں نے مؤطا امام محمدؒ کا پیریڈ شیخ شہیدؒ کیلئے چھوڑ دیا: دو سال قبل مجھے فرمایا کہ اسباق زیادہ باقی ہیں بنابریں میں بدھ کے روز بھی آؤں گا اور اس دن ظہر کے بعد آپ کا مؤطا امام محمدؒ کا درس ہوتا ہے میں نے عرض کیا ضرور تشریف لائیں گا۔ ہمارا پیریڈ تو ویسے بھی خانہ پری ہوتا اصل پیریڈ اور سبق تو آپ کا ہوتا ہے۔ طلباء اس کے انتظار میں ہوتے ہیں، بلامبالغہ آپ اگر تین گھنٹے بھی تسلسل سے پیریڈ لیں تو طلباء تنگ نہیں ہوتے بلکہ مزید خوشی کا اظہار فرماتے ہیں اس پر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کے عالی اخلاق ہیں کہ ہم جیسوں کو برداشت کرتے ہیں۔

بیماری کی وجہ سے سکرین پر درس دینا: مولانا سمیع الحق شہیدؒ جب حیات تھے تو شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس شہیدؒ کو کمر میں درد کی شدید بیماری لاحق ہوئی۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا اور سفر پر تو پابندی لگا دی۔ اس ساری صورتحال کے پیش نظر دارالعلوم حقانیہ کے طلباء کا حرج مدنظر رکھ کر اپنے گھر سے ہی شیخ الحدیث مولانا محمد ادریسؒ کو سکرین پر نیٹ کے ذریعہ پڑھانے کا بندوبست کروایا گیا۔ ایک عرصہ تک یہ سلسلہ چلا پھر بحمداللہ افاقہ ہونے پر بجائے ہفتہ بھر آنے کے تین دن آنے کا معمول بنایا۔ روزانہ مسلسل دو گھنٹہ پڑھاتے اور فرماتے کہ مجھے الحمدللہ تھکن کے بجائے روحانی بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ عم مکرم مولانا انوار الحق صاحب مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ بھی آپ کے قدردان ہیں۔ یہ حقیقت ہی ہے کہ قدر زر زرگر می شناسد وقدر جوہر جوہری۔ شیخ شہیدؒ بھی مولانا انوار الحق صاحب سے خوب دل لگی کرتے تھے۔

بغیر مشاہرے کے خدمت تدریس: قارئین کرام یاد رہے حضرت شیخ شہیدؒ نے دارالعلوم حقانیہ کی گیارہ سالہ خدمت بغیر کسی مشاہرے اور معاوضے کی فرمائی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ۲۰۱۶ء میں آپ دارالعلوم حقانیہ کی تدریس حدیث سے وابستہ ہوئے۔ ایک ماہ گزرنے کے بعد عم مکرم مولانا سمیع الحق شہید نے مجھے فرمایا کہ آپ شیخ ادریس کو اپنے دفتر میں لیجا کر انہیں گاڑی کی آمدورفت کیلئے پٹرول کا خرچ دیدیجئے۔ میں نے ۱۵۰۰۰ (پندرہ ہزار) روپیہ لفافہ میں ڈال کر ان کے ہاتھ میں تھما دیئے تو اس پر فرمایا کہ یہ آپ کیا کررہے ہو مجھے شرمندہ کررہے ہو، کیا میں مادر علمی سے معاوضہ لوں گا؟ میں نے کہا حضرت یہ آمدورفت کا خرچہ ہے جس کا تقاضا آپ نے نہیں کیا ہم

نے ازخود دیا اس میں آپ کی طلب نہیں ہے ہمارے شیخ مولانا شیر علی شاہ قدس سرہٗ فرماتے کہ از کسے طمع مہ کن، اگر بدہد منع مہ کن۔ شیخ شہیدؒ انکار کررہے تھے اور میں مسلسل ان کو دلائل کے ساتھ آمادہ کررہا تھا۔ بالآخر میرے اصرار پر لیکر کہا کہ یہ بہت زیادہ ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں یہ معمولی رقم کچھ بھی نہیں ہے اگر آپ نہیں لیں گے تو میں خفا ہوں گا۔ بہرصورت دارالعلوم حقانیہ سے انہوں نے تادم شہادت کسی بھی قسم کا معاوضہ نہیں لیا۔

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھودیئے پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

۲۵ پچیس آدمیوں کا آپؒ کے ہاتھوں اسلام قبول کرنا اور تبلیغی جماعت کی تحسین:

دعوت وتبلیغ کے کام کی اکثر اوقات تحسین اور تائید فرماتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ میں جاپان گیا تو وہاں مختلف مقامات پر میرے بیانات ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے تحدیث بالنعمۃ کے طور پر کہتا ہوں کہ پچیس غیر مسلم افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے اب ان لوگوں کے بارے میں مجھے فکر لاحق ہوئی کہ میں تو پاکستان واپس چلا جاؤں گا انہیں وضوء نماز روزہ کے مسائل اور احکامات سکھلانے ہونگے جن پر سوچ وبچار کے بعد یاد آیا کہ یہاں کے تبلیغی مراکز میں بھی میرے بیانات ہوئے ان کی ذمہ داری لگالیتا ہوں لہٰذا ان کے ذمہ ان ۲۵ نومسلموں کی تعلیم وتربیت کا کام لگادیا۔ فرمایا کہ اب اگر یہ تبلیغ والے حضرات نہ ہوتے تو ان نومسلموں کا کیا بنتا؟ گاہے گاہے وہ تبلیغی حضرات مجھے موبائل سے رابطہ کر کے کہتے ہیں کہ اب آکر ان نومسلموں کو ملاحظہ کرلیجئے کہ ان کو دینی تعلیم کے ایک بڑے حصے پر عبور حاصل ہو چکا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تبلیغ ایک چلتا پھرتا مدرسہ بھی ہے اور عملی تربیت کا میدان بھی ہے۔

صفات وکمالات: معاملہ فہمی، حکمت وتدبر اور صبر شکر کے اوصاف آپ میں بطور اتم موجود تھے۔ تنازعات اور مخاصمات میں صلح وامن کی راہ ہموار کرنے کا گُر آپ کو بطور خاص حاصل تھا۔ اسباق میں روانگی، وقت کی پابندی تحمل وبرداشت اور دوستانہ ماحول کے روادار رہے۔

اعتراف حقیقت کا اعلیٰ خُلق: امسال شوال میں کسی اہم مسئلہ میں بات چیت کرتے ہوئے راقم الحروف نے عرض کیا، اس مسئلہ میں آپ کا یوں کہنا۔۔۔۔مناسب نہیں تھا اور اس سے اور بھی معاملات غلط سمت جانے لگیں گے، احقر نے زیادہ زور دیتے ہوئے کہا کہ اسی معاملہ زیرِ بحث کے حوالہ سے قیامت کے دن میں آپ کا گریبان پکڑوں گا۔ انتہائی اہم نازک امر ہے۔ انہوں نے جواب میں ایسا ظاہر فرمایا کہ میرا بھی ہاتھ ہوگا اور تمہارا گریبان ہوگا۔ یعنی میرے بھی ہاتھ ہی سلامت ہیں اور پھر شیخ شہیدؒ نے مجھ سے اپنے ایک، دوشکوے کیے، میں نے مزید تشفی کیلئے اس معاملہ کی مزید عواقب کی نشاندہی کی تو پھر فرمایا کہ نہیں مولانا مزاح اور خوش طبعی اپنی جگہ، ہم بھائی بھائی ہیں۔ میں

تسلیم کرتا ہوں کہ اس معاملہ میں مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔اس پر میں نے کہا کہ میں نے بھی بات میں زور ڈالنے کیلئے آپ کو قیامت کے دن گریبان سے پکڑنے کی بات کی۔جس پر معذرت خواہ ہوں ۔اس پر ہنستے ہوئے کہا کہ ہم سب ایک ہی گھر کے لوگ ہیں، آپس یہ نوک جھونک ہوتی رہتی ہے۔

اس سارے واقعہ سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیخ شہیدؒ کو بڑے اعلیٰ اخلاق سے نوازا۔ جب کبھی کوئی بات کہی تو اسے پتھر کی لکیر سمجھ کر اس پر اڑے رہنے کا مزاج نہ تھا ورنہ درس حدیث کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے باوجود اپنی غلطی کا اظہار کرنا اور معذرت چاہنا اس سے بڑھ کر اونچے کردار کو ڈھونڈ نا اس دور میں بڑا مشکل امر ہے۔

دیدارِ شیخ آخر شد: پس از رحلت مجھے الحمدللہ حضرت شیخ شہیدؒ کی زیارت کا سوا دو گھنٹہ تک شرف حاصل ہوا اور وہ یوں کہ میں ترنگزئی پہنچتے ہی تعزیتی پنڈال میں خطاب کرنے کے بعد حضرت شیخ کی بیٹھک (مہمان خانہ) میں جہاں وہ تشریف فرما ہوتے بیٹھ گیا۔میں نے ساتھیوں اور حاضرین مجلس جو زیادہ تر حضرت کے اعزہ واقارب اور دوست حضرات تھے کو کہا کہ آج شیخ کی نشست تو موجود ہے لیکن میر مجلس نہیں۔یہ مسند بھی رو رہا ہوگا۔بعد ازاں میں فوقانی منزل پر واقع ان کے کتب خانے گیا جہاں نماز ظہر پڑھی۔یہاں حاجی عبدالرحمٰن سابقہ سنیٹر اور مولانا مفتی محمد ندیم محمودی صاحب اور دیگر علماء سے ملاقاتیں ہوئیں کچھ دیر بعد میں وہاں کتابوں کے مطالعہ میں لگ گیا۔تہذیب الکمال کے کچھ اوراق پلٹے، پشتو میں مولانا مولانا شاہ فیصل کی ترمذی کی شرح پر سرسری نظر ڈالی۔لغات القرآن پر مبنی کتاب تھوڑا بہت ٹٹولا۔سوا چار بجے حضرت شیخ شہیدؒ کی جسد کو لیجانے کیلئے ایمبولینس لایا گیا۔ہزاروں لوگ گھر کے دروازے میں ان کے دیدار کیلئے بے تاب نظر آرہے تھے، انصار الاسلام کے کارکنوں نے بڑی دقت کے ساتھ لوگوں کو ہٹا کر بمشکل ایمبولینس کو اندرونی دروازے تک لانے میں مدد کی۔بڑی تگ ودو کے بعد حضرت کی لاش کو ایمبولینس میں رکھ کر روانگی ہوئی۔حضرت کے دونوں صاحبزادگان مولانا انیس احمد صاحب، ڈاکٹر سلمان صاحب، دو داماد جناب حبیب اللہ خان صاحب، جناب عبدالماجد صاحب اور ایک برادر نسبتی مولانا عابداللہ صاحب فرزند شیخ الحدیث مولانا حسن جان شہیدؒ، راقم الحروف (مولانا) محمد عرفان الحق حقانی سمیت حضرت کے جسد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے تھے۔میں دوران وصول جنازگاہ حضرت کی دیدار سے محظوظ ہورہا اور دل خون کے آنسو رو رہا تھا کہ آج وہ ہونٹ خاموش ہیں جو کبھی ہزاروں طلباء کو پڑھانے اور کبھی ہزاروں کے مجمع کو بیان کرنے کیلئے متحرک ہوتے۔میں نے حضرت کے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ انتہائی یخ بستہ تھے۔ہائے افسوس آج وہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے زمزمے اٹھانے والی زبان خموش کی جا چکی تھی۔

وہ دن گئے جب پسینہ گلاب تھا اب عطر بھی ملوں تو خوشبو نہیں

ایک کلومیٹر کا راستہ لاکھوں لوگوں کی بھیڑ میں سوا گھنٹہ میں طے ہوا۔ ہر کوئی بے تابانہ شہید کی دید کا متمنی تھا لیکن اس کا نظم کرنا از حد مشکل تھا بناء بریں اور ماضی میں اکابرین کے اجساد کی آخری زیارات کے تجربہ کو سامنے رکھ کر دیدار عام نہ کروانے کا فیصلہ ہوا۔ ایمبولینس میں جنازگاہ کی طرف چلتے ہوئے ڈاکٹر سلمان اپنے والد کو مخاطب کرکے کہہ رہا تھا۔ ابا جان! اب آپ کو کوئی پڑھنے پڑھانے اور جلسوں میں جانے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ آپ کو اب مکمل آرام مل گیا ہے۔ گاہے گاہے کہتا کہ ابا جان ہماری قیامت کی صبح تک خاندان کے فرد فرد کی سفارش کرنا کہ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ بخش دیں۔ آپؒ کو تو طلباء و علماء کرام نیز ناداروں کی فکر رہتی کہ ان سے علاج اور ٹیسٹوں (معائنہ) کی فیس نہ لینا اپنے ذاتی جیب سے مجھے لاکھوں روپیہ دیکر ان لوگوں کے علاج کرنے کا امر فرماتے۔ اب بھی چار لاکھ روپیہ اسی مد میں میرے پاس ہیں۔ آپؒ مولانا سمیع الحق شہیدؒ اور نانا جان مولانا حسن جان شہیدؒ کے صف میں شامل ہو گئے۔ الوداع، الوداع۔ تقریباً ٦ بجے مولانا انیس احمد حقانی کی امامت میں جنازہ ادا کیا گیا۔

جنازہ کے بعد اندازہ تھا کہ لوگ پھیل جائیں گے اور دھکم پیل کی کیفیات نہ ہونگے لیکن پھر بھی خلاف توقع ان ہی کیفیات کا مسلسل سامنا کرنا پڑا۔ تقریباً پون گھنٹہ کے انتظار کے بعد حضرت کی نعش کو ایمبولینس سے اتار کر قبر میں رکھا گیا۔ ادھر سورج غرب ہو رہا تھا اور ادھر شیخ الحدیثؒ دنیا سے ہمیشہ کیلئے ظاہری بدن کے اعتبار سے ہم سے پناہ ہو رہے تھے۔ احقر کو بحمد اللہ تدفین اور قبر میں رکھنے کا شرف حاصل رہا۔ شیخ شہیدؒ کا ایک مقامی مقتدی حاجی جاوید خان اور دیگر لوگ بھی قبر اتارنے کے عمل میں شریک رہے۔

سوانحی حالات: ضلع چارسدہ کو رب العالمین نے زرخیز ہونے کے ساتھ ساتھ مردم خیز بھی بنایا ہے یہ ہر دور میں عظیم شخصیات اور تاریخ ساز ہستیوں کا مولد رہا ہے۔ اسی ضلع کے ایک گاؤں، ترنگزئی میں مجاہد کبیر حضرت حاجی صاحب ترنگزئی (فضل واحد قدس سرہٗ)، زبدۃ المفسرین حضرت العلامہ مولانا شمس الحق افغانیؒ اور فقیہہ العصر شیخ الحدیث مولانا مفتی شہزادہ نور اللہ مرقدہ پیدا ہوئے اور پوری زندگی دین متین کی خدمت میں گزاری۔ آج کل اسی گاؤں کے نامور شخصیت حضرت مولانا محمد ادریس قدس سرہٗ کا وجود بھی امت کے لئے نعمت تھے۔

نسب و پیدائش: مولانا محمد ادریس جیسی نابغہ روزگار شخصیت حضرت العلامہ حکیم مولوی عبدالحقؒ بن شیخ الحدیث والتفسیر فقہیہ العصر مولانا مفتی شہزادہؒ بن حضرت مولانا شیخ محمد اسماعیلؒ کے گھر میں ہوئی۔ ٢٢ مارچ ١٩٦١ء بمطابق

۵ شوال المکرم ۱۳۸۰ھ کو پیدا ہوئے۔

عصری تعلیم: ۱۹۷۷ء میں گورنمنٹ ہائی سکول ترنگزئی سی میٹرک کا امتحان پاس کیا۔۔ ایم اے (عربی، اسلامیات) پرائیویٹ طور پر پشاور یونیورسٹی سے کیا۔

دینی علوم: آپؒ نے عصری تعلیم کے دوران ہی گھر پر دینی تعلیم کا آغاز کیا۔ درس نظامی کی ابتدائی کتابیں صرف میر، میزان الصرف، ہدایۃ النحو، مرقات، ایساغوجی، بدیع المیزان، اصول الشاشی، کافیہ، سلم العلوم وغیرہ اپنے والد بزرگوار حکیم مولانا عبدالحقؒ سے پڑھیں اور جدامجد مولانا مفتی شہزادہؒ سے ناظرہ قرآن مجید پڑھ کر اپنے گاؤں کے ایک مجود قاری صاحبؒ جو سادات کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا سے اپنے دادا کے مشورے پر تجوید پڑھی۔ اسی طرح اپنے دادا سے اصول الشاشی، نورالانوار، پنج گنج، کریما، گلستان، بوستان، شرح الوقایہ اور کنز وغیرہ پڑھیں۔ میٹرک کے بعد درس نظامی کے بڑی کتب اور معقولات وفلسفہ کی کتابیں دارالعلوم نعمانیہ اتمانزئی میں پڑھیں۔ مولانا سید رسول ہزارویؒ، مولانا عبدالحلیم کوہستانیؒ سے معقولات میں کسبِ فیض پایا، یہاں تک کہ حضرت شیخ شہیدؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھ سے میبذی پڑھنا رہ گیا تھا تو میں نے مولانا عبدالحلیم کوہستانیؒ سے عرض کیا کہ حضرت مجھے میبذی پڑھائیں تو انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس وقت نہیں ہے تو میں نے عرض کیا کہ میں آپ کو سناؤں گا، وہ مان گئے، پھر میں رات کو گھر پر میبذی کا مطالعہ کر کے حل کرتا اور صبح نماز فجر کے بعد سائیکل پر سوار ہو کر ان کے ہاں حاضر ہوتا اور ان کو میبذی سناتا جہاں غلطی ہوتی اس کی اصلاح فرماتے۔ جب کتاب نصف تک سنایا تو پھر فرمایا کہ بس کرو آپ کو میبذی پر عبور حاصل ہے مجھے کیوں سناتے ہو؟ اس سے حضرت کی علمی استعداد کا پتہ چلتا ہے۔ موقوف علیہ سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے جید فاضل مولانا عبدالجمیل صاحبؒ جو شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ کے شاگرد تھے اور علم ادب میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ داداجانؒ نے حضرت شیخ شہیدؒ کو ان کے ہاں بھیجا اور علم ادب کی اکثر کتابیں نفحۃ الیمن، نفحۃ العرب، مقامات، دیوان متنبی، سبع المعلقات، دیوان حماسہ، متن الکافی، محیط الدائرہ اور قصیدہ بردہ تک ان سے پڑھیں۔ پھر موقوف علیہ کے اسباق اپنے دادا (مفتی صاحبؒ) سے پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ اس وقت آپؒ موقوف علیہ کے اسباق میں جلالین کامل، مشکوٰۃ شریف جلد اول وثانی، ہدایہ جلد ثالث ورابع اور بیضاوی پڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہدایہ صلوٰۃ اور ہدایہ نکاح بھی ان سے پڑھیں۔

فراغت واساتذہ: دورۂ حدیث شریف کے لئے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پہنچے۔ ۱۴۰۳ھ بمطابق ۱۹۸۳ء یہاں سے باقاعدہ فراغت حاصل کی۔ اسی سال وفاق المدارس العربیہ ملتان سے درجہ عالمیہ (ایم اے) کا سند

حاصل کیا۔ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں استاذ المحدثین شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ سے بخاری شریف کتاب المغازی اور ترمذی شریف کتاب النکاح تا آخر میں کسب فیض کیا، شیخ الحدیث فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد فریدؒ سے بخاری جلد اول کامل اور ترمذی شریف جلد اول کتاب الجنائز تک، ترمذی جلد ثانی، ابوداؤد جلد اول پڑھی، صدرالمدرسین شیخ الحدیث مولانا عبدالحلیم زروبویؒ سے بخاری شریف ابواب التفسیر اور مسلم شریف جلد اول میں استفادہ کیا۔ شیخ الحدیث رئیس الاتقیاء حضرت مولانا فضل الٰہی شاہ منصوریؒ سے ابوداؤد جلد ثانی اور طحاوی شریف پڑھی اور شیخ الحدیث استاذ العلماء حضرت مولانا سمیع الحق شہیدؒ سے شمائل ترمذی پڑھی۔ آپؒ نے فرمایا کہ ہمارے دورہ حدیث کے سال صدرالمدرسین حضرت مولانا عبدالحلیم زروبویؒ رحلت فرمائے تو بخاری شریف کا باقی حصہ جو رہ گیا تھا اسے حضرت مفتی فرید صاحبؒ نے پایہ تکمیل تک پہنچایا اور مسلم شریف کا باقی حصہ بھی انہوں نے پڑھایا۔ فرمایا کہ ہمارے دورہ حدیث کے سال جامعہ حقانیہ کے دورہ حدیث میں ۱۰۰ (ایک سو) طلبہ کرام تھے۔

دیگر امتیازات: مزید براں شیخ الاسلام حضرت العلامہ شمس الحق افغانیؒ (سابقہ شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند) کے ساتھ دلی لگاؤ تھا تفسیر اور اس کے علاوہ علاوہ مختلف علوم میں ان سے استفادہ کیا۔ مشکوۃ شریف کی آخری حدیث کا درس بھی حضرت افغانی نے دیا۔ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ کے ہاں دورہ تفسیر کیلئے تشریف لے گئے ایک ہفتہ وہاں قیام کر کے پڑھتے رہے اور پھر بیمار ہونے کی وجہ سے تفسیر مکمل نہ کر سکے اور واپس لوٹے۔

تدریسی خدمات: تکمیل علم کے بعد آپ نے علاقہ کے قدیم دینی مرکز علم دارالعلوم نعمانیہ اتمانزئی چارسدہ سے ۱۹۸۳ء میں اپنی تدریسی زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔ یہاں پر درس نظامی کے ابتدائی کتابوں سے لے کر موقوف علیہ تک کی کتابیں پڑھاتے رہیں، ۱۹۹۲ء میں دورۂ حدیث میں بخاری جلد ثانی، ترمذی جلد اول اور طحاوی شریف جیسے وقیع ومنتہی کتب کا درس بھی آپکے سپرد ہوا جہاں ۱۹۹۸ء تک تدریس کرتے رہے۔ پھر ۱۹۹۸ء میں ویسہ اٹک چلے گئے ایک سال وہاں طلباء علوم نبوت کی تشنگی بجھاتے رہے۔

۱۴۱۹ھ بمطابق ۱۹۹۹ء میں دارالعلوم جامعہ اسلامیہ تنگی چارسدہ میں دورۂ حدیث شریف کے آغاز کے لئے علماء کرام کے درخواست پر وہاں تشریف لے گئے اور شیخ الحدیث کے منصب پر متمکن ہوئے، وہاں صحاح ستہ اکیلے پڑھاتے۔ جہاں تین سو تک طلبہ شریک دورہ ہوتے تھے یہ سلسلہ کئی سالوں تک جاری رہا۔ بعدازاں جامعہ عبداللہ بن مسعودؓ ترنگزئی میں تعینات ہوئے جہاں دورۂ حدیث میں صحیح البخاری شریف (مکمل) اور موطائین پڑھاتے رہے۔

۲۰۱۳ء کو دارالعلوم اتمان زئی کے مہتمم مفتی حسن جان اور علاقہ کے دیگر علماء کرام وعمائدین کے شدید اصرار پر دارالعلوم نعمانیہ اتمان زئی کو دوبارہ زینت بخشی ۔ جہاں تادم شہادت دورۂ حدیث شریف کے کتب بخاری شریف (مکمل) مسلم شریف اور ترمذی کے پڑھانے کی خدمات انجام دیتے رہے۔

دارالعلوم حقانیہ میں تقرر: شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہ صاحب مدنی نوراللہ مرقدہ کے سانحہء ارتحال کے بعد ۱۴۳۷ھ بمطابق اگست ۲۰۱۶ء کو احقر عرفان الحق حقانی کی تحریک اور شیخ الحدیث مولانا سمیع الحق شہیدؒ کے حکم پر دارالعلوم حقانیہ میں جامع السنن للامام الترمذی جلد اول اور سنن ابی داؤد جلد ثانی کا درس شروع کیا۔مولانا سمیع الحق شہیدؒ کی شہادت کے بعد بخاری شریف کتاب المغازی کے پڑھانے کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی۔

اختصاصی دروس موقوف علیہ: شیخ الحدیث صاحب کے جدامجد مفتی شہزادہؒ اپنے دور کے بلند پایہ عالم اور معقولات ومنقولات کے جامع تھے اپنے گاؤں ترنگزئی میں تقریباً ۵۳ سال تک موقوف علیہ کے دروس پڑھائے جس میں دور دراز علاقوں سے طلباء اپنی علمی تشنگی بجھانے آتے تھے۔آپؒ کی وفات کے بعد حضرت شیخ الحدیث شہیدؒ نے اپنے دادا محترم کا یہ علمی مسند سنبھالا اور اتنی محنت وشوق اور یکسوئی کے ساتھ موقوف علیہ کے اسباق پڑھائے کہ قلیل عرصہ میں ہزاروں کی تعداد میں طلباء فیض یاب ہونے کے لئے آتے رہے۔ جب مہتمم دارالعلوم نعمانیہ کے اصرار پر دورۂ حدیث شریف کے کتب پڑھانے شروع کئے تو حضرت شیخ صاحب طلباء کے شدید اصرار پر تعلیمی سال کے چھٹیوں رجب شعبان اور رمضان میں دورۂ موقوف علیہ پڑھانا بھی شروع کیا اور ۲۰۰۲ء تک چھٹیوں کے دوران جاری رہا اور آخری سال طلباء کی تعداد ۲۶۰۰ سے تجاوز کر گئی تھی۔

عقد ازدواج واولاد: آپؒ کا عقد نکاح شیخ الحدیث حضرت مولانا حسن جان شہیدؒ کی دختر نیک اختر سے اپریل ۱۹۸۷ء کو عمل میں آیا۔دو فرزند ہیں جن میں مولانا انیس احمد حقانیہ ہی کے فارغ التحصیل ہیں جو اس وقت جامعہ نعمانیہ ترنگزئی میں صدر المدرسین کی حیثیت سے نشر واشاعتِ دین کی خدمت میں مصروف عمل ہیں اور دوسرے ڈاکٹر محمد سلمان الخیر ہیں جو طبی طور پر عوامی خدمت میں مصروف ہیں جبکہ پانچ بیٹیاں ہیں۔

سلوک واحسان: حضرت شیخ کے جدامجد ولی کامل تھے۔لہٰذا تصوف وسلوک کا آغاز بھی اپنے جدامجد کے ہاتھوں سے طریقہ قادریہ میں کیا اور ان سے خلیفہ مجاز ٹھہرے ان کی وفات کے بعد سلوک کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے، مرشد اعظم حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحبؒ سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے اور حضرت نے نقشبندیہ اور قادریہ دونوں

سلسلوں میں خلافت سے نوازا۔اس کے علاوہ سلاسل اربعہ میں ولی ومرشد کامل مولانا عبدالسلام صاحب (المعروف بہ پیر سباق باباجی صاحب) نے بھی اعزازی طور پر سلاسل اربعہ میں خلافت سے سرفراز فرمایا۔

صوبائی اسمبلی کے ممبر: ۲۰۰۲ء کے الیکشن میں آپ تنگی سے صوبائی اسمبلی کی سیٹ پر ممبر منتخب ہوئے تو اسلامی نظام کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لینے کا موقع ملا۔

سلسلہ دعوت وتبلیغ وتقریر: حضرت شیخ الحدیث صاحب کے خطبات عوام وخواص میں اتنے مشہور ہیں کہ ہر جگہ کام کاج کرتے وقت بھی لوگ موبائل وغیرہ میں ان کے محفوظ بیانات سے مستفید ہوتے ہیں۔لوگوں میں آپ کی تقریر کو کافی پذیرائی حاصل تھی اس لئے آپ کو جلسہ ہائے دستار بندی اور مدارس کے افتتاحی موقعوں پر شرکت کے لئے مجبور کیا جاتا۔آپ محبت کا سرچشمہ تھے اس لئے کوشش کرتے کہ لوگوں کو مایوس نہ کریں۔ختم بخاری شریف، دستار بندی، دورہ تفسیر القرآن آخری سورتوں کی تفسیر، راضی ناموں اور نکاح خوانی کی تقریبات میں شرکت کرتے تھے اور ایسے مواقع پر اصلاحی بیان فرماتے تھے کہ لوگوں کے دلوں میں وہ باتیں ثبت ہوجاتی۔

تالیفات: علم حدیث پر ان کی کتاب ''الفوائد الاصولیة'' علماء وطلباء میں شہرت کی حامل کتاب ہے، علوم القرآن پر بھی وکیع تصنیف ''الدروس فی علوم القرآن'' کے نام سے فرمائی، جس کی اشاعت پر مجھے ہدیہ کرتے ہوئے اس پر اپنے قلم سے یوں تحریر فرمایا: **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم هدية لصاحب الفضيلة سماحة الشيخ المخدوم المكرم مولانا عرفان الحق ادام اللہ فيوضاته آمين۔ محمد ادريس عفي عنه۔** خطبات پر بھی کام ہوا ہے تاہم منصۂ شہود پر ابھی نہیں آیا۔اس کے علاوہ کئی کتابوں پر ان کی تقریری نوٹس موجود ہیں۔

(بقیہ: وجودِ باری تعالیٰ) اللہ تعالیٰ سے تعلق بنانے کا طریقہ کیا ہے؟

اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر ہماری طرف مبعوث اور رسول بنا کر بھیجا اور قرآن پاک ساتھ لے کر آئے۔ ہمارے لئے حکم یہ ہے کہ قرآن پاک کے احکامات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارکہ پر عمل کریں۔ ہمارے لئے کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ جب قرآن پاک پر عمل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق زندگی گزاری تو دنیا بھی کامیاب ہوگی اور لامتناہی جنت بھی ملے گی یعنی دنیا وآخرت میں کامیابی مل گئی۔اللہ تعالیٰ ہم سب کے لئے نصیب فرمائے اور اس کے لئے بھی جس نے آمین کہا۔

نوٹ: انسان کی پیدائش کا مقصد صرف اور صرف اپنے خالق، مالک، رازق کی عبادت کے لئے اور اس کو راضی کرنے کے لئے ہے اور ساری کائنات اس کی خدمت کے لئے ہے۔

شخصیت

مولانا ڈاکٹر عبدالشہید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

حیات مستعار کے چند نمایاں پہلو

مولانا اکمل جمال

نعمانی خانوادے کی علمی روایت کا ایک اور درخشاں چراغ گل ہو گیا، مولانا ڈاکٹر عبدالشہید نعمانی صاحب اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و إنا إلیہ راجعون! حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی وفات ایک فرد کی نہیں، ایک علمی روایت، ایک تہذیبی ذوق اور ایک ایسے خانوادے کے فرد کی وفات ہے، جس نے برصغیر کی علمی روایت میں علم حدیث، اور تحقیق وتصنیف کے میدان میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ ان کی رحلت کی اچانک خبر پڑھ کر یکا یک ماضی کے بہت سے دریچے وا ہو گئے، ملاقاتوں کی یادیں، علمی نشستوں کی خوشبو، فون پر ہونے والی علمی گفتگو اور حضرت کی بے تکلف مسکراہٹ سب ایک ساتھ ذہن میں تازہ ہو گئیں، یوں محسوس ہوا جیسے ان کی ذات سے جڑے علم وتحقیق کے دل نشیں نغمے اب لب خاموشی اوڑھ چکے ہیں، اور علم کا ایک ایسا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے جس پر ہر طالب علم بلا تکلف دستک دے سکتا تھا۔

مولانا عبد الشہید صاحب برصغیر کے معروف محدث حضرت مولانا عبد الرشید نعمانی رحمہ اللہ کے بڑے صاحبزادے، اور ہمارے استاد جی مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب رحمہ اللہ کے بھتیجے تھے، کسی موقع پر ان سے سنا تھا کہ انہوں نے اور ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے ابتدائی تعلیم جامعہ بنوری ٹاؤن میں اکٹھے حاصل کی تھی، بعد میں ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب راولپنڈی منتقل ہو گئے، جبکہ مولانا عبدالشہید نعمانی صاحب یہیں اپنے علمی سفر میں مصروف رہے، جامعہ کراچی سے عربی زبان میں بی اے اور ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی، بعد ازاں وہیں جامعہ کراچی کے شعبہ عربی سے وابستہ ہوئے اور طویل عرصے تک تدریسی وانتظامی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ شعبہ عربی کے ڈین کے منصب پر بھی فائز رہے۔

شیخ زید اسلامک سینٹر، جامعہ کراچی کے ڈائریکٹر سمیت کئی علمی وانتظامی عہدوں پر رہے، اس عرصے میں ان کی رہائش بھی جامعہ کراچی میں رہی، زندگی کے آخری ایام میں احسن آباد کراچی سدھار گئے۔ اپنے والد گرامی کے علاوہ ان کے شیوخ میں شام کے نامور عالم شیخ عبد الفتاح ابو غدہ، مکہ مکرمہ کے شیخ حسن مشاط المالکی اور شیخ عبد العزیز

غماری کے نام نامی قابل ذکر ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی پیشہ ورانہ علمی وابستگی اگرچہ عربی زبان وادب سے تھی، اس میدان میں انہوں نے طویل عرصہ خدمات بھی انجام دیں، اور متعدد تحقیقی مقالات ان کی نگرانی میں لکھے گئے، لیکن اس کے باوجود علم حدیث، تحقیق اور تصنیف وتالیف سے ان کا رشتہ ہمیشہ مضبوط رہا، اور اپنے عظیم والد حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب اور اپنے نامور چچا مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب کی حدیثی اور علمی روایت میں انہوں نے نمایاں حصہ ڈالا، ان کی علمی خدمات میں مسند الإمام أبي حنيفة بروایة أبي نعيم الأصبهاني کی تحقیق اور اس پر تحریر کردہ مفصل و وقیع مقدمہ، ''تابعیت امام ابی حنیفہ''، امام جعفر دیبلی سندھی کی معروف کتاب ''مکاتیب النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' پر تحقیقی وعلمی کام، نیز دیگر علمی کتابیں اور متعدد تحقیقی مقالات ان سے یادگار ہیں۔ڈاکٹر صاحب سے پہلا تعارف دوران تخصص استادِ محترم مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب رحمہ اللہ کے ذریعے ہوا تھا۔پہلی ملاقات بھی استاد جی کے آباد خانے میں ہوئی، پھر تو ان کے گھر بارہا حاضری کا موقع ملا، ان کی علمی نشستوں میں شرکت ہوئی، ایک مرتبہ عنایت کر کے حضرت خود ناشتے پر لے گئے، جہاں مختلف مقالات، کتابیں اور مولانا عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ کی زیر استعمال کتابیں دکھائیں، دو تین مرتبہ انہیں معہد الخلیل الاسلامی کے شعبۂ تخصص کے حدیثی محاضرات میں ادارے کے مہتمم حضرت مولانا محمد الیاس مدنی صاحب مدظلہم کی ہدایت پر مدعو کیا، جسے انہوں نے ہر دفعہ بخوشی قبول فرما کر مستفید ہونے کا موقع عنایت کیا۔

تقریبا تین سال قبل عصر کے وقت ان کے گھر حاضری ہوئی، دو گھنٹے ان کی اور ان کے صاحبزادے ڈاکٹر نبیل صاحب، استاد شعبہ عربی جامعہ کراچی، کی معیت میں گزارنے کا موقع ملا، اس دوران جامعہ پنجاب کے شعبہ عربی کے سینئر پروفیسر ہمارے کرم فرما، جناب عبدالماجد صاحب بھی تشریف لے آئے، پھر عربی زبان، برصغیر میں اس کے مستقبل، درپیش چیلنجز اور ان کے حل پر مفصل گفتگو ہوئی، عرب ممالک میں رائج عامی لہجے اور ان کے تلفظ واداء پر بھی سیر حاصل مجلس رہی۔وہ نہایت سادہ مزاج کے بے تکلف بزرگ تھے، فون کال نہ صرف جلدی اٹینڈ کرتے، بلکہ فون پر بھی علمی گفتگو میں کشادہ دلی کا مظاہرہ فرماتے۔

مجھے یاد ہے ابھی پچھلے سال ہمارے ہاں کے شعبہ تخصص فی الحدیث کے ایک طالب علم نے سالانہ مقالے کا خطہ پیش کر دیا، کہ وہ مسند امام اعظم کے زوائد پر کام کریں گے، میں نے دیکھا تو اطمینان نہیں ہوا، کیونکہ زوائد پر کام کرنے کا معروف منہج یہاں پوری طرح منطبق نہیں ہو رہا تھا، نیز موضوع کے بعض فنی پہلو بھی میرے لیے محل اشکال تھے، چونکہ مسانید کے حوالے سے مولانا نعمانی نے ''امام ابن ماجہ اور علم حدیث'' اور علامہ حبیب الرحمن کاندھلوی نے ''امام ابوحنیفہ اور علم حدیث'' میں اچھی گفتگو کی ہے، اس کو دیکھا، لیکن تشفی نہیں ہوئی، تب اسی لمحے مجھے یاد آیا کہ

مولانا عبدالشہید صاحب سے رجوع کیا جائے، اس لیے کہ انہوں نے خود بھی ''مسندالامام ابی حنیفہ بروایت ابی نعیم'' میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔فون ملایا تو پہلی ہی کال پر جواب دیا اور تقریبا دس منٹ تک مسانید اور ان کی فنی حیثیت پر ایسی مدلل گفتگو فرمائی کہ پوری تشفی ہوگئی۔

ابھی مہینہ قبل حضرت کے گھر حاضری ہوئی، حسب سابق خود دروازہ کھول کر مہمانے خانے لے گئے، قریب ایک گھنٹے تک ان کی علمی مجلس رہی، علم حدیث، اس کے فنی مسائل، تدریسی مشکلات اور نصاب کے حوالے سے نہایت مفید نکات ارشاد فرماتے رہے، ان کی رائے یہ تھی کہ حدیث کی ضخیم کتب سے براہ راست استفادہ ہر طالب علم کے لیے آسان نہیں، اس لیے ماہرین فن کو چاہیے کہ ضروری علمی مواد کو مرتب اور ملخص کر کے طلبہ کے سامنے پیش کریں، نیز وہ محاضراتی تدریسی انداز کو زیادہ نافع اور مؤثر سمجھتے تھے، طلبہ حدیث کو متقدمین کے علوم ومعارف سے استفادے کی ترغیب دیتے تھے۔

علوم حدیث کے باب میں اپنے والد گرامی کی طرح ''اصول السرخسی''، علامہ ابن الوزیر کی ''تنقیح الأنظار'' اور اس کی شرح، جو علامہ صنعانی کی توضیح الأفکار کے نام سے معروف ہے، اس کے مطالعے کی خصوصی ترغیب دیا کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ ابن الصلاح اور ان کے منہج کے متبعین، جیسے امام نووی، حافظ عراقی، حافظ ابن حجر، علامہ سیوطی اور علامہ سخاوی رحمہم اللہ کے بعض اصولی مباحث پر علامہ صنعانی نے علمی تنقید اور مضبوط علمی اختلاف پیش کیا ہے، اس لیے علم حدیث کے طالب علم کو ان سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔

بنیادی طور پر علم حدیث کی تدوین جدید میں گراں قدر تبدیلی کے پیش رو علامہ ابن الصلاح ہیں، اسی لیے بعد میں اصول پر لکھنے والے سبھی تقریبا ان کی علمی چراگاہ سے مستفید اور ان کے خوشہ چین ہیں، چنانچہ بعض اہل علم نے ان کے ''مقدمہ'' پر شرحیں لکھیں، بعض نے اس کا اختصار کیا، بعض نے حواشی سے مزین کیا اور بعض نے اس کے مضامین کو نظمایا، لیکن علامہ ابن الصلاح کے ساتھ فنی اور سردی منہج میں کسی کا اختلاف ہے تو وہ صاحب تنقیح الانظار علامہ ابن الوزیر اور اس کے شارح علامہ امیر صنعانی ہیں۔ان دونوں کے ہاں ابن الصلاح اور ان کے اصولی منہج کے متبعین کے بعض اصولی مباحث پر علمی نقد اور اختلاف کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں، اگرچہ علامہ زرکشی اور علامہ مغلطائی نے بھی ابن الصلاح پر استدراکات کیے ہیں، حافظ ابن حجر بھی بعض مقامات پر نقد کرتے نظر آتے ہیں، علامہ ابن الہمام اور شیخ اکرم السندی، صاحب امعان النظر کے ہاں بھی قابل توجہ مباحث موجود ہیں، تاہم علامہ ابن الوزیر اور علامہ صنعانی کی حیثیت اس باب میں منفرد ہے۔

علامہ ابن الوزیر اور علامہ امیر صنعانی دونوں یمن کے تھے، ایک وہاں کے معروف خاندان ''آل وزیر'' اور

دوسرے ''آل امیر'' سے تعلق رکھتے ہیں، زیدی مکتب فکر سے ہیں، علامہ ابن الوزیر نویں صدی ہجری کے ہیں، **العواصم والقواصم** اور اس کی تلخیص **الروض الباسم**، اور **ایثار الحق علی الخلق** کے مصنف ہیں، اس کے علاوہ بھی کلام، فقہ، اصول اور ادب میں ان کی عمدہ تصانیف ہیں، علامہ صنعانی بارہویں صدی ہیں، حافظ ابن حجر کی **بلوغ المرام** کی شرح **سبل السلام** اور علامہ سیوطی کی **فیض القدیر** کی شرح **التنویر** کے نام سے لکھی ہے، دیگر کئی وقیع کتابوں کے مصنف ہیں، عربی ادب اور شعر کا بھی عمدہ ذوق رکھتے ہیں، ان کا دیوان بھی چھپا ہے، انہیں علامہ ابن الوزیر کے علوم کا وارث سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ یمن میں ابن الوزیر کے علمی منہج کو پھیلانے اور رواج دینے میں ان کا زبردست کردار رہا ہے۔ ان کی متعدد کتابوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔ علامہ شوکانی نے **البدر الطالع** میں دونوں کا شاندار تذکرہ کیا ہے، دونوں کو مجتہد اور مجدد کہا ہے، حقیقت بھی یہی ہے کہ یمن میں علامہ ابن الوزیر کی تاسیس کردہ علمی وحدیثی منہج کی چھاپ ایسی ہے کہ بعد کے کبار علمائے یمن جیسے: علامہ امیر اسماعیل صنعانی، علامہ رباعی، علامہ شوکانی، علامہ جلال، علامہ مقبلی وغیرہ سب اس سے متاثر ہیں؛ بلکہ غالب طور پر انہی کا منہج یمن میں رائج رہا ہے۔

استاد محترم مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب نے علم حدیث میں مولانا حیدر حسن خان ٹونکی سے استفادہ کیا تھا، جو ندوۃ العلماء لکھنو کے شیخ الحدیث تھے، استاد جی یہ بھی بتاتے تھے کہ مولانا نعمانی نے ندوہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، بلکہ مولانا ٹونکی سے خصوصی استفادہ کیا تھا، مولانا ٹونکی کے برادر بزرگ مولانا محمود حسن خان ٹونکی، صاحب ''معجم المؤلفین'' کی تصنیف میں بھی معاون رہے تھے، یہی بات مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب نے بھی لکھی ہے، نیز مولانا عبدالشہید نعمانی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بھی لکھا ہے کہ مولانا نعمانی دونوں بھائیوں کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔

مولانا حیدر حسن خان ٹونکی رحمہ اللہ نے چونکہ شیخ حسین بن محسن یمانی سے استفادہ کیا تھا، اس لیے ان کے حدیثی منہج پر یمنی علمی روایت کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں، عمومی طور پر بھی علم حدیث میں یمن کے علمائے حدیث کے منہج کو ترجیح دیتے تھے، علامہ عبدالحی لکھنوی ''نزہۃ الخواطر'' میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

وكان طريقه في ذلك طريق العلامة محمد بن علي الشوكاني في نيل الأوطار، وكان من أشياخ أشياخه، وكان مؤثراً لكتب علماء اليمن كالعلامة السيد محمد بن إبراهيم الوزير، والأمير محمد بن إسماعيل الصنعاني، والعلامة المقبلي وغيرهم۔

یعنی اس باب میں ان کا منہج وہی تھا جو علامہ شوکانی نے نیل الأوطار میں اختیار کیا تھا، نیز علامہ شوکانی ان کے شیخ

الشیوخ میں سے تھے، وہ یمن کے اہل علم خاص کر سید محمد بن ابراہیم الوزیر، امیر محمد بن اسماعیل الصنعانی اور علامہ مقبلی جیسے حضرات کے تصانیف کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ مولانا ٹونکی کے علمی رجحانات اور پسندیدہ مصنفین پر نظر ڈالی جائے تو ان کے ہاں یمنی محدثین کے منہج کا اثر واضح محسوس ہوتا ہے، خصوصاً فہم حدیث اور ترجیح دلائل کے باب میں۔ مولانا عبدالرشید نعمانی نے اس باب میں ان سے استفادہ کیا تھا، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حدیث و اصول حدیث کا وہ خاص علمی ذوق، جو یمنی اہل علم کے منہج سے متاثر تھا، مولانا حیدر حسن خان ٹونکی رحمہ اللہ اور ان کے علمی حلقے کے واسطے سے ہمارے ہاں منتقل ہوا، دوسری طرف مولانا ٹونکی حنفیت میں بھی نہایت متصلب تھے، علامہ لکھنوی لکھتے ہیں: **وكان متصلباً في المذهب الحنفي، شديد الحب والإجلال للإمام أبي حنيفة، عظيم الانتصار له مع إجلال للأئمة الثلاثة۔**

غالباً حنفیت کا مضبوط رنگ بھی شاید اسی نسبت سے مولانا نعمانی حاصل ہوا ہو۔ مولانا عبدالشہید صاحب بھی اپنے والد گرامی کی طرح اسی منہج کی طرف مائل تھے، اسی لیے ان کتابوں کے مطالعے کی ترغیب دیا کرتے تھے، ساتھ ہی وہ علامہ کوثری کے بھی مداح تھے، ان کے مولفات سے استفادے کی بھی تلقین فرماتے تھے، نیز اپنے والد گرامی کے مصنفات وتعلیقات خاص کر ''امام ابن ماجہ اور علم حدیث'' تبصرہ بر مدخل ''التعقیبات علی صاحب الدراسات'' اور ''التعلیقات علی ذب ذبابات الدراسات'' کی طرف خصوصی توجہ دلاتے تھے۔ احناف کے ہاں متعدد اصولی مباحث میں خیر القرون کے تعامل، اس زمانے کی شخصیات کے استنباط واستدلال اور تعدیل وتجریح خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب رحمہ اللہ اور استاد جی حضرت چشتی صاحب رحمہ اللہ بھی خیر القرون کے حدیثی ذخیرے کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی طرح مولانا عبدالشہید نعمانی صاحب کے لیے خیر القرون میں تدوین حدیث خاصی دلچسپی کا موضوع تھا، مجھے یاد ہے ایک دفعہ محاضرے کے لیے ان کو شاید ''مسانید امام ابی حنیفہ'' کا موضوع گفتگو کے لیے دیا تھا، مگر وہ تشریف لائے تو فرمایا: میں تو ''تدوین حدیث قرن اول اور قرن ثانی میں'' کے موضوع پر گفتگو کروں گا۔

اسی آخری دفعہ کی مجلس میں مجھ سے فرمایا کہ تخصص میں عام اصولی مباحث کے علاوہ خیر القرون کے اصول سے بھی طلبہ کو روشناس کرانا چاہیے، اس پر میں نے عرض کیا کہ بندہ نے اس پر مختصر مقالہ بھی لکھا ہے، یہ سن کر بہت خوش ہوئے، ان کا مزید کہنا تھا کہ والد صاحب کی رائے تھی کہ احناف نے تدوین حدیث کا کام بہت پہلے مکمل کر لیا تھا، استنباط مسائل میں ان کے سامنے اپنے ائمہ کے مرتب کردہ احادیث کے ذخائر تھے، نیز یہ کہ احادیث کے پرکھنے کے لیے ائمہ احناف کے اصول زیادہ جامع اور معیاری تھے، جن کی ایک جھلک اصول فقہ کی کتابوں میں ''السنة'' کے

عنوان کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔

بہر حال یہ ایک خوبصورت مجلس تھی، جس میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کا نمایاں حصہ ہمارے تعلیمی نصاب اور موجودہ تعلیمی نظام پر اصلاحی تنقید کا تھا، گفتگو کے اختتام پر انہوں نے فرمایا:

''ہم یہ باتیں اس لیے کرتے ہیں کہ شاید کسی کے دل میں اتر جائیں، اور ان سے فائدہ اٹھالے۔''

میں نے از راہ مزاح گستاخی کرتے ہوئے عرض کیا: ''حضرت! سمع خراشی تو ہوتی رہنی چاہیے!''

اس پر مسکرا کر فرمایا: اگر آپ اسے سمع خراشی سمجھتے ہیں تو بھی ٹھیک ہے، لیکن یہ باتیں ہوتی رہنی چاہئیں۔

یہ جملہ ان کے اخلاص، دردمندی اور اصلاح احوال کے جذبے کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ ملاقات کے اختتام پر انہیں تخصص فی الحدیث کے محاضرات کے لیے دوبارہ دعوت دی تھی، جسے انہوں نے حسب سابق نہ صرف قبول فرمایا، بلکہ آنے کا وعدہ بھی فرمایا، اور اپنی عادت کے مطابق دروازے تک رخصت کرنے تشریف لائے، تب ہرگز گمان نہ تھا کہ ملاقاتوں اور استفادے کا یہ سلسلہ اتنی جلدی ختم ہو جائے گا، مگر قدرت کا فیصلہ تھا!

حقیقت یہ ہے کہ مولانا ڈاکٹر عبدالشہید نعمانی صاحب ان سادہ مزاج، مخلص، صاحب علم اور صاحب درد بزرگوں میں سے تھے جن کی قدر ان کے جانے کے بعد زیادہ محسوس ہوتی ہے، ان کی یہی خصوصیت کافی تھی کہ علم کو اپنے پاس روک کر رکھنے کے بجائے دوسروں تک پہنچانے میں خوشی محسوس کرتے تھے، یہی ان کا درد تھا، جس کا بارہا مشاہدہ ہوا۔ ان کی علمی مجلسوں کی رونق اب باقی نہیں رہی، مگر ان کی گفتگو کے علمی موتی، ان کی تحقیقات، ان کے شاگرد اور ان کے علمی آثار ان شاء اللہ ان کے لیے صدقہ جاریہ بنتے رہیں گے! وہ رخصت ہو گئے، مگر ان کی یادیں، ان کا علم اور ان کی علمی روایت اب بھی باقی ہے۔ وہ چراغ بزم علم و آگہی تو بجھ گیا روشنی لیکن ابھی تک اس کے افکاروں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی علمی خدمات قبول فرمائے، درجات بلند فرمائے، ان کے علوم و آثار کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ **رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ، واسکنہ فسیح جناتہ!**

(بقیہ: سافٹ ویئر کی حقیقت وماہیت)

جب کوئی عالمی مارکیٹ میں سافٹ ویئر خریدتا ہے تو عمومی طور پر وہ دراصل اس معاہدے کے تحت سافٹ ویئر حاصل کرتا ہے جس میں درج ہوتا ہے کہ "سافٹ ویئر لائسنس یافتہ ہے، فروخت نہیں کیا گیا، اور سافٹ ویئر فروخت کرنے والی کمپنی، سافٹ ویئر کے تمام حقوق محفوظ رکھتی ہے۔ یہ لائسنس آپ کو کوئی حق نہیں دیتا، اور آپ غیر قانونی طور پر ایسا نہیں کر سکتے ہیں: سافٹ ویئر یا سروسز کو شائع، کاپی، کرایہ، لیز، فروخت، برآمد، درآمد، تقسیم یا قرضہ دینا، جب تک کہ سافٹ ویئر کمپنی آپ کو واضح طور پر ایسا کرنے کی اجازت نہ دے"۔